عبدالماجد دریابادی

سلیم قدوائی

عبدالماجد دریابادی

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں، اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلم بند کر رہا ہے۔ یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ، دوسری صدی عیسوی)

(بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی)

ہندستانی ادب کے معمار

عبدالماجد دریابادی

سلیم قدوائی

ساہتیہ اکادمی

فہرست

حرف اوّل

عبدالماجد دریابادی ایک جامع حیثیات شخصیت تھے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں مولانا عبدالماجد دریابادی ان ادیبوں میں سے تھے جن کی شخصیت کو پہلودار کہنا مناسب ہوگا۔ ان کی زندگی میں صرف طول ہی نہیں بلکہ عرض بھی تھا۔ مذہبیات، فلسفہ، نفسیات، ادبیات، تنقید، صحافت ہر میدان میں انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ وہ بیک وقت ایک صاحبِ طرز ادیب و انشاپرداز، بلند پایہ صحافی، مفسر قرآن، فلسفی، نفسیات داں، محقق و نقاد اور عالم باعمل تھے۔ پروفیسر احتشام حسین نے ان کی تحریر کے گوناگوں موضوعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی زندگی کے تصنیفی اور ادبی پہلو کے متعلق سچ کہا تھا کہ :

> "اردو میں شاذ و نادر ہی ادیب ہوں گے جن کے یہاں قرآن و حدیث، تصوف و اخلاق، فلسفہ و نفسیات، سوانح و سیرت، سفر نامہ و ڈائری، سیاسی موضوعات اور سماجی مسائل، شاعری اور تخلیقی نثر، افراد و تحریکات کے متعلق بے تکلفی اور ادبی لطافت کے ساتھ اظہار خیال میں تازگی۔ لطفِ زبان۔ نشتریت اور بلاغت بھی ہو یہ ساری خوبیاں مولانا عبدالماجد کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں۔"
>
> فروغ اردو، عبدالماجد دریابادی نمبر ص ۹۸

عبدالماجد دریابادی جیسی ہمہ جہت شخصیت پر لکھنے کے لیے بڑی قابلیت، علمیت اور صلاحیت کی ضرورت ہے۔ ان کی شخصیت اتنی ہمہ گیر واقع ہوئی ہے کہ اس کے ہر ہر پہلو پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے، ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جاسکتا ہے۔ مجھ جیسے مبتدی اور ناآشنائے علم و ادب کے لیے عبدالماجد دریابادی جیسی شخصیت کا احاطہ کرنا اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا آسان نہیں۔ پھر بھی میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اگلے صفحات میں موضوع کے ساتھ انصاف کرسکوں۔ جس چیز نے مجھے اس کام

کے لیے اکسایااور حوصلہ دیا وہ خود مولانا عبدالماجد دریابادی کی تعلیم و تربیت ہے۔ مجھے فخر اور خوشی ہے کہ بچپن سے لے کر جوانی تک مجھے ان کی صحبت کا شرف حاصل رہا۔ ان کی باتوں کو سننے کا موقع ملا اور ان کے ذریعہ ہی مجھے قلم پکڑنا آیا اور اردو زبان جو کچھ بھی ٹوٹی پھوٹی سیکھی وہ ان سے براہ راست اور ان کی تحریروں سے سیکھی۔ بچپن سے ان کی ادبی اور صحافتی تحریریں خواہ پوری طرح سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں برابر پڑھتا رہا۔ ان ہی باتوں کی بنا پر میں نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی۔ عبدالماجد دریابادی کی گوناگوں شخصیت کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کے لیے میں نے زیادہ تر خود ان ہی کی تحریروں پر انحصار کیا ہے، میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں۔

آخر میں میں یہ اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں کہ محترم پروفیسر گوپی چند نارنگ کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اس مونوگراف کے سلسلہ میں میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں جناب مظہر امام کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر مرحلہ پر میری ہر ممکن مدد کی۔

سلیم قدوائی

سماجی، تاریخی اور سیاسی پس منظر

عبدالماجد دریابادی انیسویں صدی کی آخری دہائی میں پیدا ہوئے تھے جو ہندوستان اور اور لکھنؤ میں ایک قدیم زمانہ تھا۔ تہذیبی، ثقافتی، ادبی اقدار، رہن سہن، وضع و قطع ہر اعتبار سے وہ ایک قدیم زمانہ تھا۔

یہ وہ دور تھا جب انسان استبداد اور استعماریت، جاگیرداری اور غلامی کی تاریکی سے نکل کر آزادی، انصاف، مساوات اور خودداری کی روشنی میں داخل ہونے والا تھا۔ پرانے عقیدوں اور اقدار زندگی کی جگہ جدید خیالات افکار وجود میں آرہے تھے۔، مغرب کی مادیت مشرق کی روحانیت کو نرغے میں لینے کی کوشش کررہی تھی۔ نئے نئے علوم، نئی نئی ایجادات اور پیداور کے نئے نئے ذرائع ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ ان تمام نئی چیزوں کے پس منظر میں ایک نیا طرز احساس کام کررہا تھا جس کا مرکزی نقطۂ نظر تسخیر فطرت تھا مغربی طرزِ فکر فطرت کی تمام پابندیوں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں بنے بنائے فکری سانچے، سماجی ضابطے اور اقدار و افکار سب اس کی زد میں آگئے تھے۔

عبدالماجد دریابادی کی پیدائش کے وقت انگریزی سامراج پوری طرح ہندوستان کی قسمت کا مالک بن چکا تھا اور بچپن میں ان کے دیکھتے ہی دیکھتے عوام و خواص میں انگریز سے مرعوبیت بڑی حد تک پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے جب اعلیٰ تعلیم کے میدان میں قدم رکھا تو اس وقت کے انگریزی نصاب تعلیم پر مغرب کی لبرل ازم کی ان اقدار و روایات کی گہری چھاپ تھی جس کے ڈانڈے انیسویں صدی کی عقلیت (RATIONALISM) سے ملتے تھے۔ اس تعلیم اور نصاب تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس عہد کے شرفاء کے گھرانوں کے نوجوانوں کو سلطنت برطانیہ کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے۔ اس دور میں عام طور پر نوجوان اس خدمت کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

سیاسی سطح پر ایک نہایت ہنگامی اور پُر آشوب دور تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برصغیر ایک نئے اور بڑے انقلاب سے دو چار تھا۔ نئی نئی سیاسی جماعتیں اور تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ ان میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، تحریکِ خلافت، ہوم رول خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سیاست کے افق پر سے نئے لیڈر ابھر کر سامنے آرہے تھے، ان میں تلک، گوکھلے، مہاتما گاندھی، علی برادران، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، سی۔ آر۔ داس، پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ سول نافرمانی، سودیشی اور نمک سازی کا رواج تھا۔ غیر ملکی حاکموں کے خلاف نفرت کا لاوا ابلا پڑتا تھا۔ اس بے چارگی، بے بسی، غلامی اور پستی کے دور میں بھی ایسے پر اثر ادیب، شعلہ بیان مقرر اور خطیب اور بیدار مغز سیاست داں پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے بلند خیالات سے ذہنوں کی تربیت کی۔

ادبیات میں بھی یہ دور بڑی دوررس تبدیلیوں کا دور تھا۔ اس دور میں پہلے ترقی پسند تحریک کا اور بعد میں عدم مشروطیت کا غلغلہ بلند ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آزاد اور حالی نے تطہیر ادب کی جو مہم شروع کی تھی وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ شعر و ادب، تنقید حیات اور تفسیر حیات دونوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ادب مسائل حیات انسانی کے اظہار کا مؤثر ذریعہ بن گیا اور وہ زندگی کے مسائل سمجھنے اور سمجھانے کا فرض انجام دینے لگا تھا۔ یہی ماحول اور زمانہ تھا جس میں عبدالماجد دریابادی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ایک غیر معمولی حساس انسان ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نہ تو بے خبر رہ سکتے تھے اور نہ ہی مختلف واقعات اور حادثات کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ ان کے علمی اور ادبی کیریر پر اس دور کے گہرے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اس پس منظر کو سامنے رکھنا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت اور کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔

حالاتِ زندگی

پیدائش: عبدالماجد دریابادی کی پیدائش ایک معزز، خوشحال اور دین دار قدوائی خاندان میں ۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء کو ہوئی تھی۔

وطن: ان کے خاندان کا آبائی تعلق اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی میں واقع قصبہ دریاباد سے تھا۔ یہ قصبہ لکھنؤ اور فیض آباد ریلوے لائن پر فیض آباد اور لکھنؤ کے وسط میں واقع ہے یہ انگریزی حکومت کے شروع میں خود ضلع رہ چکا ہے اور اس سے قبل اودھ کی سلطنت میں بھی اسے اہم مقام حاصل تھا۔ یہ قصبہ سلاطین شرقی کے عہد میں آج سے تقریباً چھ سو سال قبل آباد ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے شروع سے لے کر اب تک اس چھوٹے سے معمولی قصبے کی پہچان عبدالماجد دریابادی کی ذات کی وجہ سے ہی قائم رہی اور اس کی شہرت ان کے نام کے توسط سے برصغیر بلکہ دنیا بھر میں ہوئی۔ عبدالماجد دریابادی کی وفات پر اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مرحوم کے بھتیجے اور داماد ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں بجا طور پر لکھا تھا:

"یہ سطور لکھ رہا تھا تو محسوس ہوا کہ جیسے دریاباد تاریخی اعتبار سے کچھ ہو، اب مرحوم ہی کے نام پر وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ امتیاز اس صدی اور ہمارے ہی دیار کے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو۔"

'صدق جدید'، ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء

عبدالماجد دریابادی کی زندگی کے تقریباً ۵۵ برس دریا آباد میں ہی گزرے۔ وہ ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ سے مستقلاً دریا آباد منتقل ہو گئے تھے تاکہ لکھنے پڑھنے کا کام پرسکون ماحول میں یکسوئی سے کر سکیں لیکن لکھنؤ ان کی آمد و رفت کثرت سے رہتی تھی جہاں ان کے خاندان کا بڑا حصہ مستقل طور پر رہتا تھا۔ لکھنؤ میں

ان کا قیام "خاتون منزل" کی تاریخی عمارت میں رہتا تھا اور لکھنؤ ان کے لیے وطن ثانی کی حیثیت رکھتا تھا۔

خاندان اور ماحول: ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ قاضی القضاۃ شیخ معزالدین عرف قدوۃ العلوم والدین یا عرف عام میں قاضی قدوہ تھے۔ ان کا زمانہ روایت کے مطابق دسویں صدی عیسوی کا تھا۔ قاضی قدوہ کی نسل میں کوئی دس پشتوں کے بعد ایک نمایاں ہستی مخدوم شیخ آبخش کی نظر آتی ہے۔ جنھوں نے قصبہ دریاباد کی بنیاد ڈالی۔ مشہور یہ ہے کہ ان کے مرشد نے ان کے لیے مجاہدہ آب کشی کا تجویز کیا تھا یعنی پانی بھر بھر کر مسافروں اور نمازیوں کو پیش کریں۔ اس وجہ سے ان کا لقب آب کش پڑ گیا۔

شیخ مخدوم کی گیارھویں پشت میں مولوی مظہر کریم پیدا ہوئے جو عبدالماجد دریابادی کے حقیقی دادا تھے۔ مولوی مظہر کریم اور ان کے بڑے بھائی حکیم نور کریم جو عبدالماجد دریابادی کے حقیقی نانا تھے۔ اپنے علم، فضل، تقویٰ، بردباری، استقلال مزاج، سخاوت اور اصول پسندی کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے ددھیال اور ننھیال دونوں کے خصائص ورثے میں پائے تھے۔ مولوی مظہر کریم شاہی زمانہ میں مفتی تھے۔ ۱۸۲۹ء میں وہ بسلسلہ ملازمت شاہجہاں پور پہنچے اور ترقی کرتے کرتے سر رشتہ دار فوجداری ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران ان پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور ۹ سال کی سزا عبور دریائے شور سنادی گئی۔ ایک انگریز J.F. TANTHOHE نے ۱۸۹۶ء میں غدر شاہجہاں پور کی ایک ضخیم داستان انگریزی میں شائع کی۔ اس کتاب میں بغاوت کا سرغنہ مولوی مظہر کریم کو ہی قرار دیا ہے اور خوب خوب انھیں جلی کٹی سنا کر اپنا دل ٹھنڈا کیا ہے۔ اس میں شہر میں ان کے اثر واقتدار کو ہر جگہ تسلیم کیا ہے۔ اس اسیری کے دوران مولوی مظہر کریم نے کسی انگریز کی فرمائش پر عربی کی مشہور لغت جغرافیہ کا ترجمہ اردو میں کر ڈالا۔ اس کے صلہ میں ان کی سزا میں کمی کردی گئی اور وہ ۱۸۶۵ء میں رہا ہو کر وطن واپس آگئے اور باقی عمر دریاباد میں رہ کر عبادت اور لکھنے پڑھنے میں بسر کی۔

والدین: عبدالماجد دریابادی کے والد مولوی عبدالقادر اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ وہ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ ملازمت کا آغاز اسکول کے فارسی کے استاد کی حیثیت سے کیا۔ ہردوئی میں کسی انگریز کو فارسی پڑھائی اور اس نے خصوصی سفارش سے عدالت فوجداری کی سر رشتہ داری دلادی۔ اپنی محنت، ایمان داری اور فرض شناسی کی بنا پر ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ تک پہنچے جو اس زمانے میں ہندستانیوں کے لیے ترقی کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنی نیکی، دیانت داری، سخاوت اور خدمت خلق کی خوبیوں کی بنا پر بلا تفریق مذہب و ملت عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ یتیموں بیواؤں اور غریب عزیزوں پر خرچ کرتے اور ملازموں کے قصور سے اکثر چشم پوشی کرتے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ اخبارات

میں مذہبی موضوعات پر برابر لکھتے رہے۔ ۱۹۱۲ء میں بیوی اور بیٹی کے ساتھ حج کرنے گئے اور مکہ میں انتقال ہوا۔ ان کی شادی اپنے بڑے چچا حکیم نور کریم کی بیٹی نصیر النساء کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ نہایت مذہبی، فیاض اور غریب پرور تھیں۔ گھر میں جو کچھ ہوتا وہ فوراً سب کو بانٹ دیتیں۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم: عبدالماجد دریابادی کا بچپن خوشحالی میں گزرا۔ گھر میں ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے ملازم موجود تھے۔ شاید اسی وجہ سے بچپن سے ہی طبیعت میں تحکمانہ میلان پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ بہت اہم ہے جو ان کے اندازِ فکر، کردار اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ خود انہی کے الفاظ میں :

"دستور برادری اور گھرانہ میں پانچویں برس بسم اللہ خوانی کا تھا۔ اپنی عمر کا ابھی چوتھا ہی سال تھا کہ بسم اللہ کرنا طے پا گئی۔۔۔۔ مولوی صاحب بے چارے نے پیار و شفقت کے لہجہ میں کہا کہ "کہو بسم اللہ" یہاں جواب میں قطعی خاموشی۔۔۔۔ والد مرحوم کو آخر غصہ آیا اور چھڑی ہاتھ میں لے جاناشروع کر دی لیکن زبان نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ آخر میں میری کھلائی نے مجھے گود میں اٹھایا اور الگ لے جا کر کہا کہ کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ کہنا نہیں آتی۔ اچھا زور پکار کر مولوی صاحب کو تو سنا دے۔ بس میں ان کے ساتھ جا کر مولوی صاحب کے کمرے کے باہر سے انھیں سنا کر چلا آیا۔ ٹیڑھا لگا ہے خط قلم سرِ شت کو!" آپ بیتی، ص ۶۲

اس واقعہ سے ایک چیز خاص طور پر شروع سے ہی ان کی زندگی میں کار فرما نظر آتی ہے وہ یہ کہ اگر کوئی ان پر زبردستی کوئی بات لادنا چاہتا تو اسے قبول کرنا ان کے لیے ناممکن تھا اور یہی چیز تھی جو آخر تک قائم رہی یعنی وہ خود جس چیز کو صحیح سمجھیں وہی کہیں اور وہی کریں۔

گھر پر قرآن ناظرہ، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تعلیم استادوں سے حاصل کی۔ مولوی اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں مطالعہ کیں۔ فارسی میں گلستان، بوستان اور سکندر نامہ پڑھایا گیا۔ اپنے فن پر بہترین فارسی کتاب 'کیمیائے سعادت' بھی پڑھی۔ اسی کتاب کے پہلو بہ پہلو یوسف زلیخا (ملا جامی) بھی پڑھی جسے انہوں نے اپنی آپ بیتی میں گندی اور فحش قرار دیا ہے۔ ابتدائی عربی بھی کسی حد تک سیکھی۔ انگریزی کی حرف شناسی بڑے بھائی عبدالمجید کے ہندو استاد کے پاس بیٹھ کر آ گئی۔

ان کے والد کی ملازمت چونکہ تبادلہ والی تھی اسی لئے وہ مختلف مقامات مثلاً گونڈہ، بستی، گورکھپور وغیرہ میں رہے۔ پرائمری سے دسویں جماعت تک تعلیم سیتاپور کے ہائی اسکول میں پائی جہاں ان کے والد کا قیام طویل رہا۔ عربی کے پہلے استاد لکھنؤ کے ایک شیعہ فاضل حکیم محمد ذکی تھے جو ان پر بہت مہربان تھے۔ کچھ عرصہ بعد فرنگی محل لکھنؤ کے ایک ممتاز استاد مولوی عظمت اللہ آ گئے اور انھوں نے ان

سے خوب فیض حاصل کیا۔ اس فیض کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے : "عربی ٹوٹی پھوٹی جو کچھ بھی آئی ان (مولوی عظمت اللہ) کی بدولت آئی۔" ان کے والد کے پاس پڑھے لکھے لوگ جن میں شاعر، ادیب، عالم، صحافی، ڈاکٹر و حکیم شامل تھے کثرت سے آتے تھے۔ اسی طرح سے وہ بچپن ہی سے علمی و ادبی چرچوں اور مذہبی و سیاسی بحثوں سے باخبر رہنے لگے تھے۔ ان کے بڑے چچازاد بھائی عبدالحلیم اثر اخبارات کے بڑے شوقین تھے ان کی وجہ سے اخبارات کے مطالعہ کا چسکا لگا۔ اس گھریلو ماحول کے نتیجہ میں مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک ہو گیا اور وہ ہر چھپی ہوئی چیز خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے پڑھ ڈالتے۔

اعلیٰ تعلیم: ۱۹۰۸ء میں عبدالماجد دریابادی نے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا اور اپنے بڑے بھائی عبدالمجید کے ساتھ ایک مکان میں رہنے لگے۔ کالج میں اختیاری مضامین کے طور پر تاریخ، عربی اور منطق لیے۔ انگریزی لازمی تھی۔ منطق ان کی خاص دلچسپی کا مضمون رہا انگریزی مضمون نگاری میں بہت اچھے نمبر ملے کیونکہ اس سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ عربی کا ذوق اگرچہ وہ اسکول سے لے کر آئے تھے لیکن کالج کے صاحبانہ ماحول میں اس کی وقعت ان کی نظروں میں روز بروز گھٹنے لگی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ کننگ کالج میں پہنچ کر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ دل عربی تعلیم سے اچاٹ ہو گیا۔ اور استاد بھی ویسے شفیق نہ ملے۔"

آپ بیتی، ص ۱۱۵

لکھنؤ کی لائبریریوں سے دل کھول کر استفادہ کیا خود اپنے کالج کی لائبریری سے انھوں نے اس قدر استفادہ کیا کہ کالج کے انگریز پرنسپل نے تکمیل تعلیم کے بعد جو سرٹیفکٹ انھیں دیا اس میں لکھا کہ "ان کے علم کے مطابق اس لائبریری سے کسی دوسرے نے اس قدر فائدہ نہیں اٹھایا جتنا عبدالماجد نے۔" انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد بی۔اے میں ان کے مضامین انگلش ٹیکسٹ، جنرل انگلش، عربی اور فلسفہ تھے۔ فلسفہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس زمانہ میں وہ اگرچہ سقراط، ارسطو اور ڈیکارٹ کے فلسفہ سے بے نیاز نہیں رہے لیکن ان کی اصل دلچسپی ہوم، لاک، مل، اسپنسر، بیکلے اور ڈارون سے رہی۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد ان کی خواہش فلسفہ میں ایم۔اے کرنے کی تھی۔ لکھنؤ میں چونکہ اس کا انتظام نہیں تھا اس لیے وہ علی گڑھ گئے۔

علی گڑھ اور دہلی : ۱۹۱۲ء میں وہ ایم۔اے کرنے علی گڑھ گئے علی گڑھ اگرچہ لڑکوں کا دل لگنے کے لیے مشہور ہے لیکن عبدالماجد دریابادی کا حال اس کے برعکس رہا اور ان کا دل برابر لکھنؤ میں اٹکا رہا۔ بریلی والی گاڑی ان کے ہوسٹل کے سامنے سے گزرتی تو وہ اسے حسرت کے ساتھ آتے جاتے دیکھتے کہ وہ لکھنؤ کی طرف جاتی اور اسی کی طرف سے آتی ہے۔ علی گڑھ میں ایک سال گزار کر وہ دہلی پہنچے اور وہاں کے مشہور سینٹ اسٹیفنس کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں انھیں پروفیسر شارپ جیسے فلسفہ کے قابل استاد ملے اور

مشہور علم دوست اور انسانیت دوست اور ادو نواز پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے ملنے کا موقع ملا۔ بد قسمتی سے ان کے والد کے انتقال کے بعد جو تھوڑا بہت روپیہ جس بینک میں جمع تھا وہ اسی زمانہ میں دیوالیہ ہو گیا۔ نتیجہ کے طور پر دہلی میں قیام و تعلیم جاری رکھنے کا دروازہ ہی بند ہو گیا اور وہ سلسلہ تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ واپس آگئے۔

اعزازی ممبر شپ: اسی زمانہ میں عبدالماجد دریابادی کو دو ممتاز انگریزی انجمنوں کی اعزازی ممبر شپ بھی ملی۔ کالج سے نکلنے کے بعد تھوڑے دن بعد ایک معزز انگریز کی سفارش سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پھر ارسٹوٹیلین سوسائٹی (ARISTOTALIAN SOCIETY) کی ممبری انھیں ان کی انگریزی کتاب سائیکولوجی آف لیڈر شپ کی اشاعت پر دی گئی۔

الحاد تشکیک: عبدالماجد دریابادی کی نشو و نما مذہبی ماحول میں ہوئی۔ بچپن میں مطالعہ بھی زیادہ تر مذہبی کتابوں کا ہی رہا لیکن کالج میں پہنچ کر وہ مذہب سے دور ہو گئے معاملہ یہاں تک پہنچا کہ وہ آٹھ سال تک ملحد اور مذہب بیزار رہے۔ انٹر میڈیٹ کے امتحان کے وقت امتحانی فارم کے خانہ مذہب میں بجائے مسلم کے "ریشنلسٹ" لکھا۔ اس کی وجہ یہ رہی ہو گی کہ اسی زمانہ کی تعلیم میں آزاد مطالعہ کی بڑی گنجائش تھی اور انھوں نے تو آزاد مطالعہ کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقلیت اور آزاد خیالی نے انھیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس دوران ان کی دو کتابیں اور شبلی کی الکلام کے خلاف الناظر کا سلسلہ مضامین شائع ہوئے۔ اس میں انھوں نے سخت قابل اعتراض باتیں لکھیں۔ مثلاً الکلام کو بنیاد بنا کر عقائد اسلامی، وجود باری، نبوت اور ضرورت مذہب وغیرہ پر تنقید لکھی۔ انگریزی کتاب میں بظاہر اجتماع کی نفسیات کو بنیاد بنا کر تعبیر تجزیہ کا کام انجام دیا گیا تھا۔ لیکن اس میں بھی مستشرقین کی طرح مذہب دشمنی اور تشکیک آفرینی جھلکتی تھی۔ اس کتاب کا اردو روپ فلسفہ اجتماع کے نام سے شائع ہوا۔ اسلام و ایمان سے برگشتہ کرنے میں ملحدوں کی تحریروں سے بڑھ کر زیادہ موثر وہ کتابیں ہوئی جو نفسیات کے موضوع پر اہل فن کے قلم کے نکلی تھیں اور بظاہر مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً ڈاکٹر ڈریسٹریل کی کتاب ELEMENT OF SOCIAL SCIENCE اس کتاب کی لہر اس قدر پڑتی تھی جو مذہب اور اخلاق کو ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ اس کا انداز بیان بلا کا زور دار اور خطیبانہ تھا۔ ایک اور کتاب جس نے مذہب سے برگشتہ کرنے میں اہم رول انجام دیا وہ INTERNATIONAL LIBRORY OF FAMAUS LITERATURE تھی۔ یہ کتاب بھی مذہبیات کی نہیں بلکہ ادب کی تھی اور اس کی ایک جلد میں قرآن اور اسلام کا ذکر کچھ اس طرح کا تھا جس سے ذات رسالت سے اعتقاد بحیثیت رسول کے کیا معنی، بحیثیت ایک بزرگ یا اعلیٰ انسان بھی دل سے مٹ گیا۔ اس طرح کی کتابوں اور کالج کے آزادانہ ماحول کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذہنی، فکری اور عقلی

اعتبار سے وہ تمام تر صاحب بہادر بن گئے۔ ملحد فلسفیوں اور مصنفوں کو جی بھر کر پڑھنے کے بعد ۱۹۱۸ء میں انھوں نے مطالعہ کے شوق میں مذہبی یا نیم مذہبی قسم کے فلسفیوں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ تقریباً دو برس کے اس مسلسل مطالعہ اثر یہ ہوا کہ ان ہی کے الفاظ میں :

”فرنگی اور مادری فلسفہ کا جو بت دل میں بیٹھا ہوا تھا وہ شکست ہو گیا اور ذہن کو یہ صاف نظر آنے لگا کہ اسرار کائنات سے متعلق آخری توجیہ اور قطعی تعبیر ان فرنگی مادئین کی نہیں بلکہ دنیا میں ایک سے ایک اعلیٰ اور دلنشین توجیہیں اور تعبیریں اور بھی موجود ہیں اور روحانیت کی دنیا سراسر وہم و جہل اور قابل مضحکہ و تحقیر نہیں بلکہ حقیقی اور ٹھوس دنیا ہے۔ عزت و توقیر کی مستحق۔ عمیق اور تحقیق اور تدقین کے اعتبار سے گوتم بدھ اور کرشن کی تعلیمات ہرگز کسی ل۔ اسپنسر سے کم نہیں بلکہ کہیں بڑھی ہوئی ہیں اور حکمائے فرنگ ان کے مقابلہ میں بہت پست۔ سطحی نظر آنے لگے۔“ آپ بیتی، ص ۲۴۷

اس تمام عرصہ میں مذہب سے قریب کرنے میں جن زندہ شخصیات نے ان کو متاثر کیا ان میں اکبر الٰہ بادی، مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی، عبدالباری ندوی، مہادی افادی اور بھگوان داس جیسے اکابر شامل تھے۔ نفس مذہب سے قریب لانے میں کنفیوشس کی تعلیمات۔ بھگوت گیتا۔ بدھ مت کی تعلیمات۔ مسز اینی بیسنٹ کی تھیوسوفی پر مبنی تحریریں۔ مہاتما گاندھی اور آربند وگھوش کی تحریریں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا شبلی کی سیرت النبی جلد اول۔ مثنوی مولانا روم۔ محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن نے اسلام کی حقانیت کا نقش بٹھانے میں اہم کردار انجام دیا۔ اس سلسلے میں عبدالماجد دریابادی کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا ہے :

”ضلالت مطالعہ کے راستے سے پائی۔ ہدایت بھی بحمد للہ اسی کی راہ سے نصیب ہوئی۔ زندہ شخصیتوں کو دخل خاص ان انقلابوں میں کم ہی رہا۔۔۔ ہندو فلسفہ اور جوگیانہ تصوف نے گویا کفر اور ایمان کے درمیان پل کا کام انجام دیا۔“ آپ بیتی، ص ۲۵۵

اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا رجحان تصوف کی طرف ہوا اور انھوں نے صوفیہ کے ملفوظات کا دل لگا کر مطالعہ کیا اور ان مطالعات نے ان کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا اور تقریباً دس برس تک الحاد و تشکیک کی کیفیت میں مبتلا رہ کر وہ ایک بار پھر مذہب کی طرف واپس ہوئے۔

خاص رفیق اور دوست: کالج کے زمانے طالب علمی میں جن لوگوں سے ان کے خصوصی تعلقات رہے ان میں محمد حفیظ سید عبدالباری ندوی اور خان بہادر ظفر حسین خان خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ کالج سے باہر جن بزرگوں سے تعلقات قائم ہوئے ان میں مولانا شبلی، عبدالحلیم شرر،

مولانا آزاد، مرزا محمد ہادی رسوا، پنڈت بشن نرائن، سید سلیمان ندوی، پنڈت برج نرائن چکبست، بابو گنگا پرشاد ورما، مہدی افادی، اکبر الٰہ آبادی، عبدالباری فرنگی محلی، مولوی مسعود علی ندوی، حاجی ظفر الملک، چودھری محمد علی ردولوی، سید محفوظ علی بدایونی اور راجہ محمود آباد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان تمام حضرات سے کسی نہ کسی درجہ میں اثرات قبول کیے۔

سیرت سازی میں شخصیات کا اثر: عبدالماجد دریابادی نے اپنی زندگی میں مشہور شخصیتوں سے اثرات قبول کیے جن کا دائرہ شبلی اور اکبر سے لے کر اشرف علی تھانوی اور محمد علی جوہر تک پھیلا ملتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں :

"میری سیرت سازی میں سب سے زیادہ معین اور مؤثر دو شخصیتیں ثابت ہوئیں۔ ان دونوں نے کہنا چاہیے کہ زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔ ان دونوں کا فیض صحبت نہ نصیب ہو جاتا تو خدا معلوم کہاں کہاں اب تک بھٹکتا پھرتا۔ پہلا نام تو ہندوستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کا ہے۔ یہ میرے گویا محبوب تھے۔۔۔۔ دوسری شخصیت ان سے بھی اہم تر اور مفید تر جو میرے نصیب میں آئی وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تھی۔۔۔۔ بزرگ اور عابد و زاہد بزرگ متعدد دیکھنے میں آئے لیکن مصلح، مزکی، مربی تو ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔ محمد علی اگر میرے محبوب تھے تو اشرف علی میرے مقتدا و مطاع۔ محبت کے مرکز اگر وہ تھے تو عقیدت کے مرجع یہ!" آپ بیتی، ص ۳۵۲

ملازمت اور ذریعۂ معاش: سب سے پہلی ملازمت مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ کے ملی۔ شادی کے فوراً ہی بعد محبوب بیوی کو چھوڑ کر جانا آسان نہیں تھا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی اتوار کی چھٹی سے فائدہ اٹھا کر لکھنؤ آنا شروع کر دیا۔ کانفرنس کے کرتا دھرتا صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے جب اس فوری سفر کی خبر سنی تو بڑا بلیغ فقرہ کہا کہ "بس یہ حضرت ملازمت کر چکے اور یہی ہوا۔ دو مہینے کے اندر ہی طبیعت کی خرابی کا عذر بنا کر انھوں نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ ۱۹۱۷ء میں حیدر آباد میں ایک نیا محکمہ سررشتہ تالیف و ترجمہ بلبائے اردو مولوی عبدالحق کی نظامت میں کھلا۔ اس میں ان کا تقرر بحیثیت مترجم فلسفہ کے ہوا۔ طبیعت کی بے قیدی یہاں بھی رنگ لائی۔ جولائی ۱۹۱۸ء تک مشکل سے نباہ کیا۔ چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس کے بعد پھر انھوں نے کہیں اور ملازمت نہیں کی اور مکمل طور پر تصنیف و تالیف کے کام میں لگ گئے۔ کچھ عرصہ بعد نظام حیدر آباد کی طرف سے تاحیات تصنیفی پنشن مقرر ہو گئی۔ دراصل عبدالماجد دریابادی ملازمت کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت محکومیت اور ماتحتی کی عادی نہ تھی۔ ان کی طبیعت آزاد منش تھی اور ملازمت کے قواعد و

ضوابط سے میل نہیں کھاتی تھی۔ بہر حال ادب و صحافت دونوں کے حق میں ان کا ملازمت سے گریز بہتر ہی ثابت ہوا۔

شادی اور اولاد: عبدالماجد دریابادی کی شادی اس وقت کے رسم و رواج کے خلاف ان کی اپنی مرضی سے جون ۱۹۱۶ء میں خاندان میں ہی شیخ یوسف الزماں رئیس ہاندہ کی چھوٹی صاحب زادی عفت النساء کے ساتھ ہوئی۔ ان کی شریک حیات نہایت ملنسار، خوش مزاج، سلیقہ منداور بردبار خاتون تھیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بحیثیت مجموعی نہایت خوشگوار گزری، اپنی ازدواجی زندگی کے بارہ میں خود انھوں نے لکھا ہے:

"یہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ فی الجملہ اب تک جیسی گزری، قابل صد شکر اور بہتوں کے لیے قابل رشک۔" آپ بیتی، ص ۱۸۷

انھوں نے مقدار اور معیار کے اعتبار سے جتنا متنوع علمی کام کیا وہ خوشگوار اور پر سکون ازدواجی زندگی کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ ان کی بیگم کا انتقال ۱۹۶۹ء میں ہوا۔ یوں تو عبدالماجد دریابادی کے بچے کئی ہوئے۔ لیکن صرف چار بیٹیاں زندہ رہیں اور عمر طبعی کو پہنچیں۔ سب سے بڑی کا نام رافت النساء، منجھلی کا نام حمیرا خاتون۔ سنجھلی کا نام زہیرا خاتون اور سب سے چھوٹی کا نام زاہدہ خاتون تھا۔ یہ چاروں بیٹیاں ان کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید کے چاروں صاحب زادوں حکیم عبدالقوی عرف آفتاب، حبیب احمد قدوائی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی اور عبدالعلیم قدوائی کے عقد نکاح میں آئیں۔ سب سے بڑی اور سب سے چھوٹی صاحب زادی کا ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں انتقال ہو چکا ہے۔

بیعت و ارادت: عبدالماجد دریابادی کا خاندان شروع ہی سے ایک نیم صوفی خاندان سے تھا۔ ان کے دور الحاد سے مراجعت میں جہاں بہت سی چیزیں معاون ہوئیں وہاں متعدد صوفیانہ تصانیف نے بھی ان کی فکری قلب ماہیت میں اہم کردار عطا کیا۔ وہ ایک مدت تک رواجی تصوف اپنائے رہے اور مختلف مزارات پر حاضر ہوتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں وہ مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت ہو گئے لیکن ان کا اصل مرکز عقیدت تھانہ بھون کے مولانا اشرف علی رہے۔

لباس: عبدالماجد دریابادی جوانی کے زمانہ میں بڑے خوش لباس تھے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران وہ انگریزی لباس بھی پہنا کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب گاندھی جی تحریک کھدر پوشی شروع ہوئی تو اس تحریک کے اثر سے انھوں نے بھی کھدر پہننا شروع کر دیا۔ بعد میں رنگین عبا پہننا شروع کر دی۔ سر پر وہ خلافتی ٹوپی پہنتے تھے۔

انعامات اعزازات: عبدالماجد دریابادی ندوۃ العلماء لکھنؤ، دار المصنفین اعظم گڑھ،

جامعہ عثمانیہ حیدر آباد، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد، اتر پردیش اردو اکیڈمی سے کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے۔ حیدر آباد کی ریاست سے تاحیات علمی پنشن ملی۔ یوپی حکومت کی لسانی کمیٹی نے پانچ ہزار کا انعام بحیثیت بہترین مصنف اردو عطا کیا۔ ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے عربی کے عالم کی سند اعزاز مع پنشن کے ملی۔ ۱۹۷۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا جو ایک تعلیمی ادارہ کی جانب سے کسی شخصیت کی علمی خدمات کے اعزاز کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ برصغیر کی مختلف یونی ورسٹیوں میں ان کے ادبی اور صحافتی کارناموں پر تحقیقی مقالے لکھے گئے اور برابر لکھے جا رہے ہیں ان میں ڈاکٹر تحسین فراقی کا مقالہ عبدالماجد دریابادی احوال و آثار کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

مخصوص عادات معمولات: عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کی نمایاں ترین خصوصیت ترتیب و تنظیم اوقات کا انضباط اور اصولوں کا پاس ولحاظ تھے۔ انھوں نے اپنے لیے ایک نظام اوقات مرتب کر لیا تھا اور زندگی بھر وہ اس پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ وقت کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ نماز، عبادت و ریاضت اور علمی و ادبی کاموں ہی نہیں بلکہ زنانہ مکان میں آنے، لوگوں سے ملنے، کھانے، پینے غرض ہر بات کے لیے وقت مقرر تھا جس کے خلاف عمل کرتے کسی نے انھیں کم ہی دیکھا ہوگا۔ اس قدر منضبط اور نظام اوقات کی پابند زندگی میں شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ آخر عمر میں اعضا کے جواب دینے کے باوجود وہ اپنے معمولات پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے وہ ان لوگوں میں تھے جو سفر و حضر دونوں میں اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے اور مہمانی و میزبانی دونوں حالتوں میں ان معمولات کو نباہنے کی اتنی قوت انھوں نے حاصل کر لی تھی جو اپنی مثال آپ تھی پہلے سے طے کیے بغیر وہ کسی بڑی سے بڑی سیاسی و علمی شخصیت سے بھی ملنے کے روادار نہ تھے۔ وقت پر ان کو مکمل کنٹرول حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اتنے مختلف النوع کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔ گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کے ساتھ ان کے کام کی رفتار کا ایک اٹل اور غیر متزلزل نظام تھا وہ کام کو عبادت اور خالی بیٹھنے کو گناہ سمجھتے تھے وقت کو ضائع کرنے سے بڑا اور کوئی جرم ان کے نزدیک نہیں تھا۔ دوپہر کو وہ کھانا اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ پھر جم کر لکھنے پڑھنے کا کام نہ ہو سکے گا۔

عبدالماجد دریابادی کے مزاج میں فطری طور پر غصہ تھا گو اس میں وقت کے ساتھ کمی آگئی تھی اور یہ ایک درجہ میں مولانا اشرف علی تھانوی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"خلقتہً میں بڑا غصہ ور تھا — اب بھی غصہ ور ہوں تو اللہ کے فضل سے اور حضرت تھانوی کے فیض صحبت سے اس کی کیفیت کمیت دونوں میں بہت کمی آگئی ہے۔"

آپ بیتی، ص ۱۵۳

عبدالماجد دریابادی نہ تو غیبت کرتے تھے اور کوئی ایسی بات سننا پسند کرتے تھے جس میں غیبت کا شائبہ تک ہو۔ وہ ایسی بات آگے بڑھنے ہی سے روک دیتے تھے۔

وہ اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ ان کے پسندیدہ کھانوں میں مرغ مچھلی، گوشت، انڈا، پلاؤ، مکھن، بالائی، پنیر شامل تھے۔ وہ موسمی ترکاریوں اور پھلوں کو بھی شوق سے کھاتے تھے۔ مٹھائی سے خاص رغبت تھی اور حلوے ان کے گھر میں نہایت لذیذ بنتے تھے۔

ان کو اچھے اشعار سننے کے ساتھ ساتھ اچھے گانے کا بھی شوق تھا۔ قوالی سے بھی ایک زمانہ میں دلچسپی رہی تھی۔ اچھی آواز کو سن کر کبھی وجد میں بھی آجاتے تھے۔

سفر کرنے کا بھی شوق تھا۔ انتہائی مصروف اور پابند زندگی گزارنے کے باوجود وہ سفر کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ انھوں نے بیرون ملک تین سفر کیے۔ ایک تو حج کے لیے سفر حجاز اور دوبارہ وہ پاکستان گئے۔ اندرون ملک میں بمبئی، کلکتہ، مدراس، حیدر آباد، بھوپال، دہلی، پٹنہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ چھوٹے سفر عام طور سے انٹر یا پرانے سکنڈ کلاس اور بڑے سفر زیادہ تر فرسٹ کلاس یا پرانے سکنڈ کلاس میں کیے۔

وہ تصویر کھنچوانے اور آئینہ دیکھنے سے حتی الامکان احتراز کرتے تھے۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کا اہم پہلو توازن کا تھا۔ عام طور سے لوگ اشخاص، افراد کے بارہ میں افراط و تفریط میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مخالف کے اندر کسی خوبی کا تصور عنقا اور موافق کے اندر خامیوں کا ہونا بالکل محال سمجھا جاتا ہے جہاں تک عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہے ان کا دامن بڑی حد تک اس سے پاک تھا۔ وہ ان افراد سے نفرت کے قائل نہ تھے جس سے انھیں اختلاف ہوتا تھا اور اسی طرح سے وہ ان کو بھی معصوم نہیں سمجھتے تھے جس سے ان کو عقیدت تھی۔ وہ اکثر ان لوگوں سے جن سے وہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے کی غلط رائے سے اختلاف کرتے تھے اور اسی طرح سے جن کے فکر و مسلک اور عقیدہ سے ان کو اختلاف ہوتا تھا ان کی واقعی خوبیوں اور کمالات کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حضرت تھانوی کی انتہائی عظمت کے باوجود میرا یہ عقیدہ نہیں کہ ان کی تفسیر کا ہر لفظ قرآن سے متعلق آخری لفظ ہے۔"

رفقات ماجدی (مرتبہ غلام احمد حیدرآبادی) ص: ۳۵

اسی طرح سے انھوں نے ایک ممتاز ترقی پسند ادیب پروفیسر احتشام حسین کو حالی کے بعد اردو

کا سب سے بڑا نقاد بھی کہا۔

صاف گوئی زندگی بھر عبدالماجد دریابادی کا شعار رہا۔ وہ بغیر کسی ڈر، خوف یا جھجک کے جس بات کو درست سمجھتے وہی کہتے اور کرتے اور اس سلسلہ میں سمجھوتہ نہ کرتے اور نہ نفع و نقصان کی پرواہ کرتے۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کی اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ علمی معاملات میں استفسار کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ بے شمار تحقیقی کام کرنے والے ان سے اپنے موضوعات سے متعلق سوالات کرتے اور وہ باوجود انتہائی مصروفیات کے ان کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیتے۔

وہ مجلسی آدمی بالکل نہیں تھے پبلک اجتماعات، جلسے، جلوسوں سے گھبراتے اور گریز کرتے۔ عام مجلس میں وہ مرقع وقار بنے رہتے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ وہ مردم بیزار اور خشک مزاج انسان تھے۔ نجی صحبتوں اور محفلوں میں وہ کھل کر بات چیت کرتے اور ان کی گفتگو میں رعایت لفظی، ضلع جگت وشستہ اور بے ضرر ظرافت کے نمونے خوب سننے میں آتے۔

ان کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ بھی تھا کہ وہ بڑے ذرہ نواز تھے۔ اپنے سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنے کے فن میں وہ ماہر تھے۔

بچپن ہی سے ان کو پڑھنے اور لکھنے کا بے انتہا شوق تھا اور یہ شوق برابر بڑھتا رہا اور آخر سانس تک باقی و قائم رہا۔ معلومات حاصل کرنے کے وہ بے حد حریص تھے یہاں تک کہ اپنے چھوٹوں بلکہ مخالفوں تک سے پوچھنے یا سیکھنے میں شرماتے نہ تھے۔

عبدالماجد دریابادی کی ایک اور اہم خصوصیت وضع داری تھی۔ وہ پرانے تعلقات کا بے حد لحاظ کرتے تھے اور اپنی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کرتے تھے کہ تعلقات نہ صرف قائم رہیں بلکہ ان میں اضافہ ہو۔ تعلقات رکھنے والوں کے عزیزوں سے بھی وہ وہی تعلقات قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

بحیثیت بزرگ خاندان : عام طور سے دیکھا یہ گیا ہے کہ بڑے لوگ جن کی علمی وادبی مصروفیات ہوتی ہیں اور جن کو عزت شہرت کی دولت حاصل ہوتی ہے وہ گھر اور گھر والوں سے دور اور بے تعلق سے ہوجاتے ہیں ان کی مصروفیات اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتیں کہ وہ گھریلو معاملات پر توجہ دے سکیں اور گھر والوں کے لیے وقت نکال سکیں لیکن جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں اکثر بڑے لوگوں سے یکسر مختلف تھے۔ انتہائی مصروف زندگی گزارنے کے باوجود وہ گھریلو اور خاندانی معاملات میں گہری اور بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مثالی بزرگ خاندان تھے ان کی شخصیت خاندانی تنازعات اور آپسی اختلافات کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتی تھی ان کی زندگی کا

ایک خاص مقصد اور مشن آپسی تعلقات خوشگوار بنانا بھی تھا وہ اپنے لمبے چوڑے خاندان کے ہر فرد پر بھرپور توجہ دیتے اور ان کی فلاح واصلاح کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔ اپنے مصروف پروگرام میں تربیت کی مد پر روزانہ کچھ نہ کچھ وقت صرف کرتے۔ موسم گرما کی چھٹیوں میں جب خاندان کے متعدد لڑکے اور لڑکیاں دریاباد میں اکٹھا ہوتے تو وہ بڑی خندہ پیشانی اور خوشی سے اپنا وقت عزیز دیتے جن سے ان کی زیادہ دلچسپی ہوتی ان کے لیے وہ الگ سے وقت نکالتے اور سہ پہر کو باری باری ان سے مقررہ وقت کے لیے ملتے۔ ان کے مسائل سننے عام طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے مخاطب کو اپنے سے مانوس اور بے تکلف کر لیتے اور پھر ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کرتے نتیجہ یہ ہوتا کہ زیادہ تر لوگ اپنا حال دل کھول کر بتا دیتے اور ان کو اپنی زندگی کے عملی تجربات کی مثالیں دے دے کر سمجھاتے اور ہدایت کرتے۔ ان سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھواتے اور پھر اس کی روشنی میں کھل کر بات چیت کرتے۔ وہ اپنے اعزہ پر بھی نظام اوقات کی پابندی پر زور دیتے تھے۔ اور سب کے لیے ایک ٹائم ٹیبل مرتب کیا جاتا جس میں جاگنے سے لے کر سونے تک ہر کام کے لیے وقت مقرر ہوتا۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ورزشی کھیلوں پر بھی زور دیتے اور تقریری اور تحریری صلاحیتوں کی اہمیت پر بھی زور دیتے۔ ذہانت اور حاضر جوابی سے محظوظ ہوتے اور جوان سے سوالات پوچھتا وہ اس سے خاص طور سے خوش ہوتے۔ ان کی تاکید ہوتی کہ بڑا بچہ اپنے سے چھوٹے کو پڑھائے اور سکھائے۔

عام طور پر قاعدہ ضابطہ برتنے والوں کا مزاج روکھا اور ذوق محبت سے عاری ہوتا ہے لیکن عبدالماجد دریابادی پابند نظم وضبط ہو کر بھی بڑے شفیق اور محبت نواز تھے اپنی والدہ کے انتقال پر ماں کے قدموں پر بہن کے انتقال پر "ہمشیرہ کی رخصتی"۔ بڑے بھائی کی رحلت پر "ناز بردار بھائی" اور شریک حیات کی وفات پر "بوڑھی محبوبہ" کے زیر عنوان انھوں نے جو کچھ اپنے اخبار "صدق" میں لکھا ان کا لفظ لفظ گہری محبت اور اس حزن فراق کا پتہ دیتا ہے جو ایک محبت آفریں خاندانی زندگی ہی میں پایا جاسکتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی شخصیت مختلف بلکہ متضاد خصوصیات کا دلکش امتزاج تھی وہ گرم بھی تھے اور نرم بھی وہ سنجیدہ فلسفی بھی تھے اور لطیف مزاح کے مالک بھی۔ وہ کٹر مذہبی ہوتے کے باوجود دنیا بیزار نہیں تھے اگر ایک طرف ان کے مزاج میں جاہ وجلال تھا تو دوسری طرف وہ سراپا شفقت ومحبت بھی تھے۔ وہ قدیم جدید کا حسین سنگم تھے۔ ان کی شخصیت بڑی متوازن اور دلآویز تھی۔ ان کی سوانح عمری دراصل ایک تاریخی فلسفہ ہے اس لیے کہ ان کی مختصر سی زندگی میں وہ سب دور گزر چکے جو ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی تاریخ فلسفہ کا موضوع ہوئے ہیں؛ مذہب پرستی، مذہب بیزاری، تشکیک والحاد اور پھر ایمان وایقان کی طرف بازگشت ان کی ذات ان تمام مدوجزر افکار کا مرکز رہی۔

صدق گوئی، دردمندی، دلسوزی، اخلاص، وضع داری،، انصاف پسندی، فراخ دلی،، علم

دوستی، خوش مذاقی، جرائت و بیباکی، مقصد کی لگن اور رفتار و گفتار کی ہم آہنگی عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کی اہم خصوصیات تھیں۔ مخالفتوں میں اپنے توازن کو قائم رکھنا، دامن کو آلودگی سے محفوظ رکھنا اور نگاہ کی بلندی اور سخن کی دلنوازی کو برقرار رکھنا اسی وقت ممکن ہے جب سیدھی راہ پر چلا جائے۔

آخری علالت اور وفات: وسط مارچ ۱۹۷۴ء میں عبدالماجد دریابادی پر فالج کا حملہ ہوا جس سے وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو سکے۔ علاج معالجہ سے مرض میں معمولی کمی واقع ہوئی۔ انھیں لکھنے میں تکان محسوس ہونے لگا اور یادداشت پر بھی اثر پڑا۔ اس کے باوجود وہ اخبار کے لیے برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ اس دوران انھوں نے جو مختصر تحریریں یا خطوط لکھے وہ بڑی مشکل سے پڑھے جا سکے۔ ان کی دونوں آنکھیں فالج کے حملہ سے پہلے ہی بہت خراب ہو چکی تھیں خصوصاً دائیں آنکھ جنوری ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ میں اس کا آپریشن ہوا جو کامیاب رہا۔ وسط اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وہ لکھنؤ میں اپنی قیام گاہ "خاتون منزل" میں رات کو کوٹھے پر گر پڑے جس سے ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس حادثہ نے ان کی صحت پر اور برا اثر ڈالا۔ اسی روز سے وہ مستقل طور پر صاحب فراش ہو گئے اور ان کی زندگی ایک کمرہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ قبل دنیوی امور سے تعلق بالکل قطع ہو گیا تھا۔ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گیا تھا۔ زیادہ تر غافل رہتے تھے لیکن نمازوں کے وقت اکثر ہوشیار ہو جاتے تھے اور ہاتھ کان تک اٹھا کر پھر نیچے لا کر نماز کی طرح نیت باندھ لیتے۔ یہ کیفیت وفات سے کچھ قبل تک رہی۔ بالآخر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو علی الصبح ۴ ۱/۲ بجے بمقام خاتون منزل لکھنؤ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ ان کی وصیت کے مطابق ندوۃ العلماء میں مولانا ابوالحسن ندوی نے پڑھائی۔ بعد ازاں جنازہ دریاباد لے جایا گیا جہاں ان کے مکان سے متصل حضرت مخدوم آبکش کے مزار کے قریب تدفین ہوئی۔

ایک صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز

۱۹۱۳ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار الہلال میں عبدالماجد دریابادی کے بارے میں لکھا تھا :

"آج کل کے نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کو عام حالت میں حق امتیاز واستثنا حاصل ہے اور ہماری مایوسیوں میں وہ اپنے اندر ایک نشان امید رکھتے ہیں۔ میں ان کی وقعت کرتا ہوں۔ انھیں چند لوگوں میں میرے عزیز دوست مسٹر عبدالماجد بی۔ اے بھی ہیں مجھ کو یقین ہے کہ ان کا ذوق علمی اردو زبان کو انشاء اللہ بہت فائدہ پہنچائے گا۔"

الہلال۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۳ء

مولانا آزاد کی یہ پیشین گوئی بڑی حد تک پوری ہوئی اور عبدالماجد دریابادی کی ذات سے اردو کو اتنا فائدہ پہنچا کہ شاید کوئی بڑی جماعت یا انجمن بھی اس زبان کا دامن اس پیمانہ پر شاید ہی بھر سکتی جس پیمانہ پر انھوں نے بھرا۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اردو زبان وادب کی اتنی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کو فراموش نہیں کی جاسکتا۔

ادبی استفادہ کے ماخذ : عبدالماجد دریابادی نے تحریر میں باضابطہ طور پر کسی کی شاگردی نہیں کی اور خود بخود ادیبوں کے اسالیب سے استفادہ کر کے لکھنا سیکھا۔ کسی سے اصلاح نہیں لی ان کی ادبی تربیت میں سب سے بڑا ہاتھ شبلی کا تھا۔ اس کا اعتراف عبدالماجد دریابادی نے متعدد مقامات پر مختلف انداز میں کیا ہے۔ ناقابل فراموش ادبی واقعات اور شخصیات اور ان کا ایک اہم مضمون ہے جس میں انھوں نے مختلف ادبی شخصیات اور کتب سے استفادہ اور فیضان کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں :

"اپنے ہوش کی جب آنکھیں کھلیں تو سمجھیے کہ بیسویں صدی کے شروع کا زمانہ تھا۔ ادبی فضا پر اس وقت دو شخصیتیں تھیں۔ ایک شبلی دوسرے شرر۔ سنجیدہ، علمی، فکری، واقعاتی قسم کے ادبیات کے فرمانروا شبلی نعمانی تھے۔ علی گڑھ کے سابق استاد الفارق کے نامور مصنف اور بڑے بڑے اہم اور معرکہ کے مقالوں کے مقالہ نگار۔ ان انگلیوں نے جب سے قلم پکڑنا سیکھا۔ روش اعظم گڑھ کے اس مرد عظیم کی بھائی۔" نقوش، لاہور، فروری ۱۹۶۱ء ص ۵

آپ بیتی میں لکھتے ہیں :

"۱۹۰۶ء تھا یا ۱۹۰۷ء کہ زیارت پہلے ماہنامہ "الندوہ" کی ہوئی اور پھر اس کے بعد ہی صاحب الندوہ مولانا شبلی کی۔ اور الندوہ نے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا کہ اور سارے رسالے، جریدے نظر سے گر گئے اور دل و جان سے شبلی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مولانا شبلی کا علم و فضل، اسلوب زبان و طرز بیان سب دماغ پر چھا گئے اور کہنا چاہیے کہ علمی و قلمی زندگی کا ایک نیا دور اسی وقت شروع ہو گیا۔ آپ بیتی، ص ۲۱۱

رسالہ "ادیب" شبلی نمبر کے پیش لفظ میں انھوں نے صاف طور سے شبلی سے اسلوب اور فکر و فرہنگ کی سطح پر تاثر پذیری کا اعتراف ان الفاظ میں کیا :

"باضابطہ شاگردی کی سعادت اس کم سواد کے نصیب میں نہ تھی لیکن طرز تحریر کا چربہ اڑانے کی شعوری کوشش مدتوں برسوں کی، چلتے ہوئے فقیروں کو نوک زبان کر لیا۔ ڈھلے ہوئے ترشے ہوئے جملے ٹھونس ٹھانس حافظے کے خزانہ میں بند کر لیے۔ نقالی کو ایک مستقل پیشہ بنائے رکھا اور مزید خوش نصیبی یہ کہ لکھنؤ میں دو ڈھائی سال تک، کہنا چاہیے کہ روزانہ سہ پہر کو ہمیشہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے حاضری کی توفیق ہو جاتی رہی۔ اس مجلس میں عموماً ادبی، علمی، شعری، تنقیدی نقطے بیان ہوتے رہے اور کبھی کوئی تاریخی یا ذہنی موضوع بھی چھڑ جاتا۔"

ادیب، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۷

عبدالماجد دریابادی نے شبلی سے نہ صرف ایک عقیدت مند شاگرد کی طرح علمی استفادہ کیا بلکہ سیرت و شخصیت سے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ خود ان کے الفاظ میں :

"پھر بھی اگر کسی کے لیے لفظ استاد کا اطلاق ہو سکتا ہے تو بلا شک و شبہ مولانا شبلی تھے۔ ان کا ممنون احسان دل کی گہرائیوں سے ہوں، لکھنا لکھانا جو کچھ بھی آیا ان کی نقالی میں آیا۔ برسوں ان کا چربہ اتار تا رہا ہوں، ان کے فقرے کے فقرے، ترکیبوں کی ترکیبیں نوک زبان تھیں۔"

آپ بیتی، ص ۳۵۷

عبدالماجد دریابادی نے شبلی کے علاوہ دوسرے قدیم ادبا اور معاصرین سے بھی زبان ادب کی

خوبیاں سیکھیں جن حضرات کے اسالیب زبان و بیان سے استفادہ کیا ان میں مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، سرشار لکھنوی، اکبرالہ آبادی اور ریاض خیر آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

عبدالماجد دریابادی بنیادی طور پر ایک ادیب اور انشاپرداز تھے وہ ایک ایسے ادیب تھے جس کا اپنا ایک اسلوب تھا۔ انھوں نے جو طرز تحریر اختیار کیا وہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ وہ اسلوب ان کی پہچان اور شناخت بن گیا۔ تحریر پر نام درج ہو یا نہ ہو چند جملے پڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس کی تحریر ہے۔ اس منفرد اسلوب تحریر کے باعث وہ اپنے مضامین کے لیے انشا کی اصطلاح استعمال کرنا پسند کرتے تھے وہ اپنی کتاب "مقالات ماجد" کے نام سے خوش نہ تھے اور ایک ریڈیائی گفتگو کے دوران انھوں نے کہا تھا :

مقالات بے شک میری ترتیب دی ہوئی ہے لیکن یہ نام ناشر صاحب کا طبعزاد ہے۔ میں تو اسے انشائے ماجد کہلاتا۔"

عبدالماجد دریابادی تصنیف برائے تصنیف کے قائل نہیں تھے۔ وہ لکھتے ہیں :

"ہر دور میں وہی لکھا جو اپنے خیال و عقیدہ کے مطابق تھا۔ قلم سے وہی ٹپکا، وہی چھلکا جو دل و دماغ کے اندر موجود تھا۔ جب الحاد کی شامت سوار تھی تو رنگ ملحدانہ تھا۔ جب اسلام کی حلقہ بگوشی از سرِ نو نصیب ہوئی تو وہی رنگ تحریر کا بھی ہو گیا۔ کام اجرت پر کیا، رائلٹی لی، حسن تالیف یک مشت فروخت کیا لیکن اللہ نے ہر صورت میں مخالفت ضمیر کی بھٹی میں گرنے سے محفوظ رکھا۔ آپ بیتی، ص ۳۸۲

طرز تحریر کی خصوصیات :

عبدالماجد دریابادی کے اسلوب بیان خاص خوبی کی ایجاز و اختصار ہے۔ مختصر مختصر جملوں کی سادگی ان کی تحریر کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ وہ سیدھے سادے لفظوں میں اور بے تکلفانہ لہجے میں لکھتے تھے۔ ان کی عبارت چست اور متحرک ہوتی۔ محاورات اور ضلع جگت کے استعمال کے باوجود ان کی تحریر میں سادگی پائی جاتی ہے۔

وقت کی قدر کے خیال نے عبدالماجد دریابادی کی تحریر میں بھی امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ وہ تمہید میں وقت ضائع کیے بغیر جو بات بھی کہنا چاہتے تھے اسے شروع کر دیتے تھے۔

عبدالماجد دریابادی جس موضوع پر بھی لکھتے اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ویسا ہی اختیار کرتے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر مذہبی تحریروں میں انداز عالمانہ ہوتا ہے، فلسفیانہ اور تحقیقی مضامین میں وہ ایک فلسفی اور محقق کی شان برقرار رکھتے ہیں اور ادبی و صحافتی مضامین میں سادگی اور سلاست سے کام لیتے ہیں۔ غرضکہ ہر ماحول کو اسی کی حالت پر قائم رکھتے ہوئے مفہوم کو نہایت آسانی سے ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنے طرز بیان کی انفرادیت بھی جانے نہیں دیتے۔ ایک فطری ادیب کی پہچان یہ ہے کہ موضوع خواہ کتنا ہی خشک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو وہ اپنے طرز

بیان کی دلآویزی برقرار رکھے۔ جہاں تک عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہے ان کی کوئی تحریر ادبی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی۔

عبدالماجد دریابادی کے اسلوب بیان کا ایک خاص انداز یہ بھی ہے کہ مضمون کے دوران کبھی کبھی سوالات بھی خود ہی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح بحث طلب نکتہ کے متعلق جتنے بھی موافق اور مخالف سوالات ہو سکتے ہیں سب کا احاطہ کر لیتے ہیں گویا ہر خلش جو ایک سمجھدار قاری کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے اسے نہایت خوبی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کے طرز تحریر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تحریر میں ایسے الفاظ بھی کبھی کبھی لے آتے ہیں جو عام طور سے بولنے کے لیے ہی مخصوص ہیں مثلاً "ہا"۔

عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں فارسی اور اردو اشعار کا استعمال کثرت سے اور اس قدر برمحل ہوتا ہے کہ یہ استعمال سراسر آمد محسوس ہوتا ہے۔ اس سے ان کی نثر میں معنویت اور ایک خاص سرور و کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "یادِ ایام" کے تحت وہ لکھتے ہیں :

"دانت اپنے جوانی ہی کے زمانے سے گرنے شروع ہو گئے تھے۔ آخری دانت کو بھی گرے ہوئے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ البتہ اس کی ایک کرچ نیچے کے جبڑے میں بائیں طرف لگی رہ گئی تھی۔ اس ہفتے وہ بھی ختم ہو گئی۔ خزاں کی آخری پتی، شمع کی آخری بھڑک، زندگی کی آخری سانس، آخر کب تک غریب کی زندگی قائم رہتی!

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

صدق جدید، ۱۳ اگست ۱۹۶۵ء

اسی طرح کے مصرعہ کے استعمال کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ آپ بیتی میں لکھتے ہیں :

"ابھی ابھی فقرہ زبان قلم سے ادا ہوا ہے کہ "بوا نے مجھے گود میں اٹھالیا" فقرہ آج ۱۹۷۶ء میں ۷۴، ۷۵ سال کے پیر سال خوردہ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ ہائے وہ دایہ کی گود میں جانے کی لذت! اب کیا بیان ہو؟ وہ لذت جس کا بدل نہ کبھی جوانی کی گرمیاں دے سکیں نہ کبھی بڑھاپے کی خنکیاں۔ پڑھنے والے اس مقام پر پہنچ کر ایک پیر نابالغ پر ہنسنے اور مضحکہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ عجب نہیں کہ اس سن پر پہنچتے پہنچتے انھیں بھی بچپن کی پیاری معصومانہ شرارتوں کی یاد تازہ ہو جائے، غضب کی حسرت ناک سچائی بھر دی ہے کسی نے اس مصرع میں :

دو دن اے جوانی دے دے ادھار بچپن آپ بیتی، ص ۶۲

تحریر میں تاثر پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ موزوں تلمیحات کا استعمال کی جائے۔ عبدالماجد دریابادی نے اس طریق کار کو بڑی کامیابی سے متعدد جگہ برتا ہے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی جوہر کے اوپر تعزیتی مضمون میں لکھتے ہیں :

"یہ دستور بھی شروع ہی سے قائم ہے کہ جس نے ذرا سا بھی دعوائے محبت کیا، اس کا امتحان بھی ہو کر رہا۔ کسی کو سولی پر چڑھنا پڑا۔ کسی کو آرے سے چِروا دیا گیا۔ کسی کو دہکتی آگ میں کودنا پڑا، کسی سے اولاد کی قربانی مانگی گئی۔ کسی کے خاک و خون میں تڑپنے کا تماشہ دیکھا گیا۔"

وفیات ماجدی، ص ۱۱۷

عبدالماجد دریابادی کے اسلوب بیان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکثر قافیہ و سجع کے التزام کو بھی روا رکھا ہے مثلاً آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی طرف سے وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کے خیر مقدمی خطبہ کا اقتباس ملاحظہ ہو :

"آیئے آیئے میری سرزمین پر مہمان کرام! آیئے اور ایک زنانہ محاورہ میں جم جم آیئے؛ اور نزول فرمایئے میرے فرش پر ادب و صحافت کے عرش سے۔ دہلی یا شاہجہاں آباد سے، آگرہ یا اکبر آباد سے، پٹنہ یا عظیم آباد سے، رام پور دارالسرور سے، میسور سراپا نور سے، بھوپال دارالاقبال سے، بمبئی بندر سے، کلکتہ ساحل سمندر سے، حیدر آباد فرخندہ بنیاد سے، مدراس مینو سواد سے، گجرات معدن برکات سے۔" انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۳۰۱

کسی بھی لکھنے والے کی سب سے بڑی کامیابی یہ کام ہوتی ہے کہ وہ شروع ہی سے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لے۔ عبدالماجد دریابادی کے اپنے موضوع پر گرفت اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ پہلے جملے ساتھ ساتھ ہی قاری ان کے ساتھ ذہنی سفر شروع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے وہ قاری کی توجہ فوری طور پر متوجہ کرنے کے آرٹ سے بخوبی واقف تھے۔ ذیل میں چند ایسے اقتباس پیش ہیں جو اپنے اندر ایک خاص ڈرامائی کشش رکھتے ہیں :

"لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ جان عالم کا لکھنؤ، زمانہ یہی انیسویں صدی کے وسط کا آج سے کوئی پچھتر سال قبل ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینہ میں جوش تمنا، ہر شام میلوں ٹھیلوں کا ہجوم، ہر رات گاتے بجانے کی دھوم، یہاں رئیس کا جلسہ وہاں اندر سبھائی پریوں کا پیرا۔ ادھر زبان پر ضلع جگت اور پھبتیاں ادھر گلے سے تانیں اور ہاتھوں سے تالیاں، گلی گلی جنت نگاہ فردوس گوش، چپہ چپہ دامان باغباں و کف گل فروش۔"

مقالات ماجد، ص ۱۳۱

"آج سے کوئی پچیس سال ادھر کی بات ہے۔ الہلال افق کلکتہ سے نیانیا طلوع ہوا تھا اور ملک کی ساری فضا ابوالکلامی ادب وانشا کے غلغلہ سے گونج رہی تھی کہ ایک روز اس کے کسی مقالہ کے ذیل میں یہ شعر نظر سے گزرا۔

تحریر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہو گئی، لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا۔ درج صرف شعر تھا ،شاعر کا نام نہ تھا۔ دل نے کہا اور اس کہنے میں تامل و تذبذب کی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ شعر غالب کا ہے۔ دیوان غالب میں پڑھا یا اگر نہیں پڑھا تو نہ سہی۔" انشائے ماجد (جلد دوم) ص ۲۳

"مہینہ یہی جولائی کا تھا۔ ہائے یہی مہینہ جس نے پندرہ سال بعد دل و جگر خون کر ڈالا۔ اور شروع۔ بالکل شروع کی کوئی تاریخ، عجب نہیں کہ ۳۰ جون ہی کی شب ہو کہ سہارن پور شاہدرہ لائن کے قدیم اسٹیشن تھانہ بھون پر تیس مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ سہارن پور کی طرف سے کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا۔" حکیم الامت، نقوش و تاثرات، ص ۱۱

"میں کمرہ کے اندر بیٹھا ہوا غور و انہماک کے ساتھ سر جھکائے، کچھ لکھنے لکھانے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں ایک دوست لباس میں خوب عطر لگائے ہوئے، بہت آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے بلی کی سی چاپ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ کچھ خوشبو سی معاً محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ تمیز ابھی نہیں ہوئی کہ خوشبو کس شے کی ہے لیکن نفس کو خوشبو بہر حال محسوس ہو رہی ہے۔ یہ مجرد خوشبو کا احساس حس کی ایک مثال ہے۔" ہم آپ، ص ۳

"سکندر اعظم اپنے زمانہ کا پر ہیبت و جبروت کا بادشاہ ہے۔ قرب و جوار کے علاقے سر کر کے نظر اوراٹھاتا ہے اور چشم وزدن میں ایران، افغانستان اور شمالی ہندوستان کی بلند گردنیں اس کے آگے خم ہیں۔ کامیابیوں اور فتح مندیوں کے نشہ میں جھومتا ہوا نوجوان شہنشاہ اپنے وطن واپس ہوتا ہے۔ راستہ میں تپ آتی ہے۔ ایک بڑھ سے بڑا ایک اطبائے حاذقین ہم رکاب ہیں لیکن چند ہی روز میں دنیا کو نظر آجاتا ہے کہ جس قوت نے ایک عالم کو تہ وبالا کر رکھا تھا بالآخر موت سے وہ خود مسخر ہو کر رہی اور دنیا جسے قوی ترین ہستی تسلیم کر رہی تھی اسے اپنے سے قوی تر حریف مل گیا جس کے سامنے تمام اقبال پیمائیاں، ساری کشور کشائیاں، ساری حوصلہ مندیاں ہیچ ہو کر رہیں۔" مبادی فلسفہ، ص ۱۰۳

"دوسروں کی آوازیں اور بھی پست تر رہیں اور تنگ تر دائروں سے ان کی گونج آگے نہ بڑھی۔ ملک کے طول و عرض میں بس ایک ہی ہستی آئی تھی جس کی آواز شمال نے بھی سنی اور جنوب نے بھی۔ خواص نے بھی اور عوام نے بھی، اور عالموں نے بھی اور جاہلوں نے بھی اور بچوں نے بھی۔ آسام نے بھی اور سندھ نے بھی۔ اس کا کلام سن کر ڈرائنگ روم کے صوفے کھل کھلا کر ہنسے۔ اس کا پیام سن کر مسجد کے در و دیوار بلبلا کر رو دئے۔ خانقاہیں اور درس گاہیں۔ ہوٹل اور بازار۔ دفتر اور کارخانے، آزادوں کی کانگریس اور رجعت پسندوں کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور جمیعۃ العلماء، مسلم لیگ اور سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، چپہ چپہ پر اس کے نقش قدم کے نشان۔ ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز۔" انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۳۲۱

اوپر دیے گئے تمام اقتباسات عبدالماجد دریابادی کی مختلف تصنیفات میں شامل تمہیدی مضامین سے لیے گئے ہیں اور ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کو قاری کی فوری توجہ حاصل کر لینے میں کس قدر مہارت حاصل تھی۔

عبدالماجد دریابادی اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ کسی تحریر میں پرکشش اور جاندار تمہید کی طرح پراثر اور یادگار اختتام کی کیا معنویت ہوتی ہے۔ عام طور پر ان کی تحریروں کے خاتمہ پر الوداعی مناظر کی پیش کش ہوتی ہے اور ان الوداعی کلمات میں وہی گداز ہوتا ہے جیسے جیسے جدا ہونے والوں کے دلوں میں عام طور سے ہوتا ہے۔ ذیل میں چند ایسے اقتباسات کی مثالیں پیش ہیں :

"مشرق کے بدنام سخن گو اردو شاعر رخصت! تو درد بھرا دل رکھتا تھا۔ تیری یاد بھی درد والوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ تو نے موت کو یاد رکھا۔ تیرے نام بھی موت نہ آئے گی۔ تو نے غفلتوں اور سرمستیوں داستان کو خوب پھیلایا۔ شاید کسی رحمتِ بے حساب پر تکیہ کر کے، لیکن اپنی غفلتوں اور سرمستیوں کو موت و انجام کی یاد دلا کر بھی خوب دلایا، کسی کی عظمت بے پایاں کا خوف کر کے، عجب کیا کہ خدائے آمرزگار اس عالم کا ستار اور اس عالم کا غفار تیری دعاؤں اور لغزشوں کو اپنے دامن عفو و مغفرت کے سائے میں لے لے۔"

انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۳۲۱

"اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں اس انشا پرداز قلم پر جس نے یوں گدگدا کر دلایا، کتنے بگڑے ہوئے گھر الناہی تحریروں سے سدھرے ہونگے اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں ان ہی روزنوں سے پہنچی ہونگی اور افسانہ نویسی کے اجر بے حساب کا حساب اور مزد دے

انداز ہ کون کر سکتا ہے۔" انشائے ماجد یا لطائف ادب ۱۳۵

"رحمت ہو ان کی روح پاک پر۔ بزم سخن میں امیر بن کر رہے اور اقلیم تصوف و معرفت میں خسرو بن کر چکے۔ زبان پر وہ قدرت کہ ایران کے اہل زبان ان کی فارسیت کے قائل اور سلوک و فقر میں وہ مرتبہ کہ جو تذکرہ صوفیہ و سالکین ان کے نام نامی سے خالی وہ خود ناقص و تمام۔"

نشریات ماجد، ص ۱۴۴

"زندگی میں کبھی خیال بھی کیوں ہوگا کہ ان کا آفتاب اقبال بھی کبھی غروب ہوگا آخر دنیا ان کو بھولی اور ایسا بھولی کہ جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ انجام اس سرائے فانی میں جب ان کے بڑوں کا اور بار ہا ان کے بڑوں کے بڑوں کا بھی ہو چکا ہے تو یہ بیچارے کس شمار میں تھے۔ رہے نام اللہ کا۔ جسم فانی تھا فنا ہو گیا۔ جسم کے سارے لازمے، دولت و حشمت وغیرہ فنا ہو گئے۔ ہزار ہا بے کسوں حاجت مندوں، ناداروں، مظلومین کی دعائیں جو ساتھ گئی ہیں ان کا تعلق باقی ہے اور زندہ ہیں اور انشاء اللہ زندہ رہیں گے جب تک قائم رہ جانے والی زندگی از سر نو نہ مل جائے۔"

وفیات ماجدی

عبدالماجد دریابادی کے اسلوب کی ایک امتیازی خوبی عبرت آگینی اور عبرت آفرینی بھی ہے۔ اس کی چند مثالیں پیش ہیں :

کھلے میدان میں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ دل ہمیشہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ رفیقہ ء زندگی ہی کے آخری لمحات حیات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے۔"

وفیات ماجدی

چشم تصور کے سامنے ذرا وہ وقت لایئے جب آج سے چار صدی قبل اس شہنشاہ ہند کا انتقال ہوا ہوگا۔ ظل سبحانی" کے اٹھ جانے کی خبر سے رعایا کے دل پر کیا گزری ہوگی؟ وہ دن کیسے کٹا ہوگا؟ بادشاہ کی تجہیز و تکفین کا منظر کتنا موثر ہوگا؟ جنازہ کا جلوس کس شان سے اٹھا ہوگا؟ نماز جنازہ کس نے پڑھائی ہوگی۔ جس جگہ آج مقبرہ ہے اس وقت یہاں کون رہ رہا ہوگا۔ جن لوگوں کے لئے بادشاہ پرستی بطور ایک دینی عقیدہ کے رچی ہوئی تھی ان سے بادشاہ کے لئے قبر کیوں کر کھدی ہوگی؟" ڈھائی ہفتے پاکستان میں یا مبارک سفر، ص ۲۹

"اب کی ایسا ہوا کہ بمبئی کے ایک انتہائی فیشن ایبل حلقہ مالابار ہل سے گزرتے ہوئے جگمگاتی کوٹھیوں کے درمیان ایک ویرانہ پر گزر ہوا۔ ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا ایسا نظر پڑا جس پر کبھی کوئی عمارت رہی ہوگی۔ دلبیر نے بتایا کہ یہ جنجیرہ ہاؤس تھا۔ مکان کیسا پر رونق، دلکش اور سجا سجایا

ہوگا اور اپنے اس انجام سے بالکل بے خبر۔ ابھی اس تصور کو اس تذکرو تفکر سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ ایک دوسرا پلاٹ بہت بڑا نظر کے سامنے آگیا۔ سر تا پا کھنڈر۔ ملبہ پر ملبہ اور رہبر نے جو بتایا اس سننے کے لئے دل کسی طرح تیار نہ تھا۔ ہاتف غیب کے بجائے رہبر کی زبان سے نکلا "نظام حیدر آباد کا محل تھا۔" سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر، ص ۴۸

"مزار کے پائینتی ایک نیم کا درخت ہے۔ ہر سال اپنے پر نئے پھول لاتا ہے۔ نئے سرے سے سر سبز و شاداب ہو جاتا ہے۔ اب کی بھی اس وقت اس پر بہار ہے۔ ابھی کل تک کیسا سوکھا سا کھا بے رونق ٹھونٹھ ایسا کھڑا تھا۔ آج کیا گلزار ہے۔ کیا مہک دے رہا ہے۔ نرم نرم ہلکی ہلکی ہری پتیاں کیسی آنکھوں میں کھبی جارہی ہیں۔ سفید سفید پھول کیسے خوشنما کھلے ہوئے ہیں جیسے مردے میں جان پڑگئی۔ اللہ اللہ درخت کے لئے یہ سر فرازیاں اور انسان کی قسمت میں محرومی، بہاروں پر بہاریں گزرتی جائیں گی اور یہاں دید و شنید کی حسرتیں۔ حسرتیں ہی بنی رہیں گی۔"
صدق جدید، ستمبر ۱۹۶۹ء

"ہاں تو سن لڑکی! آج جو تو باپ اور چچا کے ہاتھوں اپنی آزادی کو قید میں تبدیل ہوتے دیکھ رہی ہے اور اپنا گھر اجاڑ کر دوسرے کا گھر آباد کرتے جارہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بے فکری کی جو نیندیں اب تک سوئی وہ آج ختم ہورہی ہیں۔ بے گھر اس گھر سے ہو رہی ہے جسے آنکھ کھول کر اپنا گھر سمجھا تھا۔ چھوٹ رہے ہیں وہ در و دیوار جہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، الگ ہورہا ہے وہ مکان جہاں عمر کی اتنی منزلیں گزار لیں ہنس ہنس کر اور کھیل کھیل کر۔ جدا ہو رہا ہے وہ گھر و ندا جسے گرمیوں چھاؤں اور جاڑوں کی دھوپ میں سیکڑوں بار سجایا سنوارا، جہاں بیٹھ بیٹھ کر بارہا اپنی گڈیوں اور گڈوں کو مانگا اور بیاہا، پرایا ہو رہا ہے وہ صحن جس میں مدتوں دوڑی، کھیلی، گری۔ بے وفا نکل رہے وہ دالان جن میں بارہا ضدیں کیں، روئی مچلی۔" خطبات ماجد، ص ۱۰

اوپر دئے گئے چند اقتباسات سے پتہ چلتا ہے عبدالماجد دریابادی کی تحریر میں گداز وگریہ کا عنصر کسی قدر غالب تھا اس تمام عبرت اندوزی میں ان کا طریق کار ایک ماہر فن کا ہے۔ دردناک جذبات کو زبان دینے کے لئے انہوں نے موزوں ترین الفاظ کا انتخاب کیا مثال کے طور پر مرشد آباد پیلس کی کم سن لڑکی نوشابہ کے انتقال پر وہ لکھتے ہیں:

"اور پردہ نشیں غم زدہ ماں! لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو رو بھی نہیں رہی ہیں۔ محض سکتہ کا عالم طاری ہے۔ بے شک آنسو سلب ہوگئے ہونگے لیکن کلیجہ کی کھرچن کو کیا کر رہی ہونگی۔ ہر لمحہ جو زبردست ہوک سینے میں اٹھتی ہوگی اس کا کیا علاج ہے۔ پتھر کی نہیں آخر گوشت پوست ہی

کی عاجز و ناتواں مخلوق ہیں۔ آرزوؤں اور تمناؤں کے ہرے بھرے باغ کو مٹتے ہوئے دیکھ کر خود زندہ کیسے رہیں۔"

انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۴۰۳

تاثر آفرینی کے لئے انہوں نے تخاطبی لہجہ کے علاوہ استفہامیہ لہجہ بھی کہیں کہیں اختیار کیا ہے مثلاً تصدق احمد شیروانی کی موت پر لکھتے ہیں :

"مرنے والا مر چکا، جینے والے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کتنے ایسے ہیں جو ایسے امتحانوں میں ثابت قدم نکلیں گے۔ کیا اس غریب کی قسمت میں یونہی دن کاٹنے تھے اور یونہی ساری عمر بسر کر دینی تھی۔"

انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۴۷۵

یہاں سوالیہ انداز نے عبارت میں جوش۔ زور اور اثر پیدا کر دیا ہے۔ تاثیر پیدا کرنے کے گر سے عبدالماجد دریابادی بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے اپنی تحریر میں تاثیر پیدا کرنے کا ایک اور ذریعہ استعمال کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی تضاد سے بھی کام لیتے ہیں اور اسکے ذریعہ اپنے بیان کو موثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ مولانا محمد علی کی موت کے سانحے پر لکھتے ہیں :

"شب برات ایک خیر و برکت والی رات ہے۔ کسے خبر تھی کہ یہ شب شب قیامت بھی بن سکتی ہے۔ مسلمان تو اس رات کو جاگ جاگ کر گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسی رات کو ان کا نصیبہ سلا دیا جائے گا۔ زندگیاں مانگتے ہیں۔ صحتوں کے لئے گڑگڑاتے ہیں۔ کسے خیال تھا کہ عین اسی وقت وہ اٹھا لیا جائے گا جس کے وجود سے ملت اسلامیہ کا وجود تھا۔"

انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۴۵۹

اوپر دیے گئے اقتباس میں عبدالماجد دریابادی نے تضاد سے کام لیتے ہوئے بتایا ہے کہ شب برات کے موقع پر لوگ جاگتے ہیں لیکن اسی مبارک رات میں مولانا محمد علی سو گئے۔

جہاں ایک طرف عبدالماجد دریابادی نے اپنے قلم سے انتہائی موثر اور عبرت انگیز مرقع پیش کئے وہاں دوسری طرف ان کی شگفتہ نگاری کے جوہر ان کے انشائیوں اور خاکوں میں نہایت خوبی سے کھلے ہیں۔ ان کا قلم جس طرح سوز و گداز میں ڈوبا ہوا تھا اسی طرح ایسی عبارت لکھنے پر بھی قادر تھا جس کو پڑھنے سے سرور و انبساط کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ذیل میں اس طرز کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

"بہار کا موسم آتے ہی چمن میں روح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، خشک درخت سبز ہو جاتے ہیں۔ پھول کھلنے لگتے ہیں جسم انسانی کی رگوں میں تازہ خون کی گردش ہونے لگتی ہے۔ سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھتی ہیں اور چستی و توانائی کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ جسم مادی کی کائنات میں آفتاب کا ایک پورا دورہ گزر جانے کے بعد یہ موسم آتا ہے اور طبیبوں کا بیان ہے کہ جسم

سے مادہ فاسد کے دفع کرنے اور مسہل لینے کا یہ بہترین زمانہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح روح و جان کی کائنات بھی چاند کا ایک پورا دورہ گزر جانے کے بعد موسم بہار آتا ہے۔ ماہتاب کو عشق کے سودازدوں سے جو مناسب ہے ظاہر ہے۔ ماہتاب جب اپنے سالانہ سفر کا چکر ختم کرتا ہے تو عشق و محبت کی اقلیم میں پھر شوریدگی و جنون کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور سال کے گیارہ مہینے کے اندر غیرت کی جو کدورتیں جم جاتی ہیں طبیعت ان کو دفع کرنے لئے بے قرار ہو جاتی ہے۔"

عبدالماجد دریابادی حیات و خدمات، ص ۸۰

ایک خاکہ میں انھوں نے مزاح کی شگفتہ سامانی کا منظر ان الفاظ میں پیش کیا:
"ہر حال میں خوش رہتے، اپنی کھال میں مست، جہاں پایا پڑ رہے۔ جہاں بھی جگہ مل جائے بیٹھ گئے یا لیٹ گئے۔ ایک بار میں لکھنؤ میں تھا کہ بیوی دریاباد میں سخت علیل ہو گئیں خبر پاتے ہی میں پہلی گاڑی سے دریاباد روانہ ہو گیا مگر لکھنؤ کچہری کی تکٹری میں ان سے ملتے ہوئے جانا نہ بھولا۔ یہ ملے نہیں۔ رقعہ لکھ کر ان کے نام چھوڑ آیا کہ "خود تو دریاباد بھاگا جا رہا ہوں۔ اب آپ جانیے اور آپ کے اللہ میاں۔ کہہ سن کر میری بیوی کو دوبارہ زندگی دلوائیے۔ گھر پہنچا تو بیوی کو پورا افاقہ ہو چکا تھا۔"

معاصرین، ص ۱۰۸

"بہار کی بہار" میں جب عبدالماجد دریابادی اپنے ایک میزبان کے ساتھ وہاں کے ایک اسپتال میں جاتے ہیں تو اس کی خوش منظری کا ذکر بڑے شگفتہ انداز میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
"لق و دق اسپتال کی خوش منظری کا کیا کہنا۔ نیچے دریائے گنگا برسات کے موسم میں خوب چڑھا ہوا۔ اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ موجزن۔ حد نظر تک وہی نظارہ۔ اسپتال کی چھت سے دیکھیے تو دریا پر سمندر کا گمان گزرے اور پٹنہ بمبئی نظر آنے لگے۔ کسی طبیب کی خوش جمالی سے متاثر ہو کر سنا ہے کبھی کسی شاعر نے کہا تھا:

خوش طبیب است بیا تا ہم بیمار شویم

اس اسپتال کی خوش سوادی سے متاثر ہو کر عجب نہیں جو بہت سے تندرستوں کے دل یہ تمنا پیدا کرنے لگیں، کاش بیمار ہی ہو کر ہمیں اس چھت سے یہ نظارہ کرنے کو ملے۔"

سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر، ص ۳۲

حکومت ہند نے جب اپنے ایک اعلان میں "اکنی" کو بطور قانونی سکہ ختم کرنے کا اعلان کیا تو عبدالماجد دریابادی نے "اکنی" کے نام سے ایک دلچسپ انشائیہ تحریر کرتے ہوئے لکھا:
"اکنی کا شمار کوئی بہت پرانے سکوں میں نہیں۔ بلکہ زیادہ عمر کے لوگوں کو تو ابھی اس کا اجرا یاد

ہوگا۔ ۱۹۰۷ء ہی سے تو چلی تھی۔ پہلے کوڑی اور بعد کے دھیلے کا دور ختم ہونے کے بعد اب غرباء بلکہ متوسط الحال لوگوں کا بھی سب سے زیادہ محبوب اور مرغوب، کار آمد اور چلتا ہوا سکہ یہی تھا اور کتنی خوشگوار یادیں بچپن سے لے کر اب تک نکل کے اس چھوٹے سے سکہ سے وابستہ ہیں۔ ایک آنہ کی مونگ پھلی سے جیب کیسے بھر جاتی تھی، ایک آنہ کی مٹھائی اتنی مل جاتی تھی کہ کئی کئی حصے اس میں لگ جاتے تھے۔ ایک پلیٹ فارم ٹکٹ ایک آنہ کا۔ اخبار کا پرچہ ایک آنہ میں۔ ریلوے ٹائم ٹیبل ایک آنہ میں۔ قلی کی مزدوری ایک آنہ میں۔ یکہ کا کرایہ ایک آنہ۔ غرض ہماشا کا حاجت روا ایک آنہ" صدق جدید، اگست ص ۱۹۵۳ء

اسی طرح کی ایک اور مثال عبدالماجد دریابادی کا دلچسپ انشائیہ "جانگھیا" ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"جانگھیا بھی لباسوں میں کوئی لباس ہے ؟ محض رانیں ڈھکی ہوئی۔ باقی ساری ٹانگیں کھلی ہوئی۔ کسی بھلے آدمی اسے محض جانگھیا پہن کر باہر نکلنے کی فرمائش کیجیے اور دوخط میں لکھا جائے تو عجب نہیں وہ منھ نوچ لے لیکن جانگھیا کے بجائے نکر (Nicker) بول دیجیے تو دیکھیے معاً، ہی اہانت عزت میں اور وہی گنوار پن فیشن زندگی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ؟ اس لئے شائد اور محض اس لئے کہ "جانگھیا" دیسی ہے اور نکر "ولایتی"۔ آج کوئی ہمارے سامنے دستر خوان پر صبح ناشتہ کے وقت گھی میں چپڑی ہوئی روٹی پیش کردے تو ہم اپنے دل میں کہیں اور ممکن ہے کہ زبان پر بھی لے آئیں کہ کیا واہیات کھانا اور کیسا گنوار پن ہے حالانکہ ہمارے باپ دادا اسے بڑی خوشی سے کھاتے آئے ہیں لیکن کہیں بریک فاسٹ کے وقت میز پر نان پاؤ کے ٹکڑے مکھن کے ساتھ آجائیں تو پھر دیکھیے ہم کس رغبت و شوق سے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں ! یہ کیوں ؟ اس لئے کہ گھی چپڑنا کہنگی کی یادگار اور قدامت پرستی کی علامت ہے اور مکھن لگانا خاص ماڈرن ازم کی دلیل۔ آپ ذرا کسی سفید پوش کو موچی کہہ کر پکارے تو پھر دیکھیے وہ آپ پر کس طرح برس پڑتا ہے لیکن اگر اسی کو شوز مرچنٹ کہہ کر مخاطب کیجیے تو دیکھیے وہ کس نیاز مندی سے آپ کا استقبال کرتا ہے ! حالانکہ دونوں لفظوں کے مفہوم میں کیا فرق ہے۔ بجز اس کے کہ ایک میں صاحبیت کی جھلک ہے اور دوسرے میں ہندستانیت کی بو ! گلی ڈنڈا آپ کھیلئے تو وحشی ہیں۔ جانگلو ہیں۔ غیر مہذب ہیں۔ لیکن کرکٹ کے لئے گیند بلا ہاتھ میں لے لیجیے تو معاشائستہ ہیں۔ مہذب ہیں۔ کلچرڈ ہیں۔" صدق جدید، دسمبر ۱۹۶۶ء

اس طرح کی آخری مثال ان کے مشہور مقالہ "الفاظ کے جادو" سے پیش ہے :

"جوئے یا جواریوں سے ظاہر ہے ہماری شرافت کو کیا تعلق ہو سکتا ہے کوئی ہمیں جواری کہہ

دیکھیے۔ اپنی جان اور اس کی جان ایک کر دیں لیکن گھوڑ دوڑ کے دنوں میں اور کارنیوال کی راتوں میں، دن دھاڑے اور بجلی کی روشنی میں بھی ذلت ہمارے لئے عین عزت بن جاتی ہے۔ بڑے بڑے رئیس اور معززنہ جوئے کی بازی لگاتے ہوئے شرماتے ہیں اور نہ اپنے کو رئیس باز کہلاتے۔ نخاس میں کسی کباڑیے کی دوکان پر مول تول کرنا ہماری عزت و شرافت کے لئے باعث ننگ لیکن مال روڈ پر" بیک ایلین "کی کوٹھی میں گشت لگانے میں نہ کوئی عار ہے نہ شرم۔ اس لئے کہ بیک ایلین" صاحب کوئی کباڑیے تھوڑا ہی ہیں" آکشنر "اور" نیلامیے" ہیں۔ چوک اور امین آباد میں کسی حلوائی کی دوکان سے پوری مٹھائی اپنے ہاتھ سے خریدیے تو نظریں بچا بچا کر، لیکن حضرت گنج میں ویلریو کی دوکان کے سامنے اپنا موٹر کھڑا کر کے کیک و پیسٹری کی خریداری بہ نفس نفیس، بلا جھجک فرمایئے۔ اس لئے کہ "ویلریو" حلوائی نہیں "کنفکشنر" ہے۔ نظیر آباد کے کسی چوراہے پر کسی شربت والے کی دوکان سے فالودہ کا گلاس خریدنا آپ کی خود داری کے منافی لیکن حضرت گنج میں صاحب کی جگمگاتی دوکان پر آئس کریم نوش فرمانا آپ کی عزت اور شان کے عین مطابق ہے۔ کسی نانبائی کی دوکان کا نام اگر ریسٹوراں پڑ جائے تو وہی عار فخر میں تبدیل ہو جائے۔ نائی بیچارہ جب تک محض نائی ہے یا حجام اس کے استرے اور کسوت کے آگے سر جھکانا آپ کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں لیکن وہی جب اپنے کو ہیر ڈریسر Hair dresser کہلانے لگے اور اپنی چوراہے کی دوکان پر ہیئر کٹنگ سیلون "کا سائن بورڈ لگا دے تو وہی ناگوار آپ کے لئے خوشگوار اور پسندیدہ بن جائے۔"

انشائے ماجد یا لطائف ادب، ص ۱۳۷

عبدالماجد دریابادی کے طرز تحریر کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی طنز نگاری بھی ہے۔ طنز نگار کی حیثیت سے اردو وطنزیہ ادب میں ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ انھوں نے ادبیات کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے مواد اور ہیئت دونوں میں طنز کو جس کامیابی کے ساتھ برتا ہے اس کی مثال کم از کم اردو زبان میں ملنا مشکل ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کے نشتر بھی ہوتے ہیں جن کی چبھن صاحب معاملہ کے دل کی دھڑکن بن جاتی ہے، ان کی طنزیہ تحریروں سے بہترین اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں۔ درج ذیل چند اقتباسات سے ان کی طنز نگاری کے فن میں مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ "امریکہ آپ اپنی نظر میں" ہر سال امریکہ میں پچاس ہزار خودکشی اور چار لاکھ اقدام خودکشی کے واقعات)۔ اور یہی حاصل و ثمرہ حسن تہذیب و تمدن کا ہے آپ اس کو لینے کے لیے اپنے سر اور آنکھوں سے تیار رہتے ہیں۔

۲۔ "نرخ بالا کن" (یوپی کی وزارت میں اضافہ کل تعداد ۴۶) جب ہر ممبر کامنتہائے نظر وزارت یا نائب وزارت ہو تو وزارتوں کے بھوکوں کی سیری اور آسودگی اتنی تعداد سے کیوں کر ہوسکے گی اور ناممکن نہیں کہ آگے چل کر وزیروں کی تعداد خود ممبروں کے برابر سرابر ہی ہو جائے۔ آہ گاندھی جی اوران کا دیش۔

۳۔ "جاہ و شہرت کی بے ثباتی" (ایک کتاب "ونسٹن چرچل کا قتل جو چرچل کی ہزاروں ہجوؤں کے جواب میں بطور مدح شائع ہوئی ہے) یہ چرچل کون ہیں جنگ عظیم ثانی میں برطانیہ کے سب سے بڑے ہیرو۔ فطرت بشری کے تلون مزاج اور جاہ شہرت کی ناپائیداری کی یہ کیسی عبرت ناک مثال ہے۔

۴۔ "داغ اپنی جمائے جاتا ہے" (لکھنؤ میں پتنگ بازی کے مقابلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے) شاباش لکھنؤ! اور زندہ باد ملت اسلامیہ! ایسے میدانوں کے مرد میدان سوا "خیر امت" کے اور کہاں مل سکتے ہیں! ہوش ربا گرانی نے مزانیم فاقہ کشی کا چکھادیا ہو، خطرہ کے بگل پر بگل بجتے جارہے ہوں بے فکروں کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور نہ چھوٹنے پائے!

محشر میں خلق اپنی مصیبت میں مبتلا
اور داغ کو یہ دھن کہ آئے کوئی خوب رو پسند

"ایک نئے طائفہ کی سرافرازی" "ہندستان میں روس کے ایک ثقافتی وفد کی آمد کے سلسلہ میں (ناچ رنگ کی محفلیں کوئی راجہ مہاراجہ، نواب گرم رکھے تو گردن زدنی لیکن "انڈو سوویٹ فیسٹیول" نام رکھ کر ایک سوشلسٹ جو بھی کرے وہ قابل داد اور لائق تحسین۔

"سازندہ کا اعزاز" (مشہور امریکی وائلن بجانے والے مینوہن کو ملکہ برطانیہ کی طرف سے کے بی کا خطاب دیے جانے پر جو کہیں آپ کس کس کی زبان سے بطور افواہ یہ بھی یہ سن لیں کہ کسی طبلچی، کسی سارنگیے، کسی پکھاوجی کو فلاں شہنشاہ دہلی نے پنج ہزاری یا ہفت ہزاری منصب سے سرفراز کردیا تھایا فلاں شاہ اودھ نے اسے اپنے دربار کے امرامیں شامل کرلیا تھا تو شرم سے آپ کی آنکھیں نیچی ہو جاتیں اور عجب نہیں کہ تحقیر و تمسخر کے ساتھ آپ ہنس بھی پڑیں لیکن یہی جب برطانیہ سے فرانس سے امریکہ سے آتی ہے تو اسے آپ احترام کے کانوں سے سنتے ہیں۔ اور آپ کا دل و دماغ اسے آرٹ نوازی، فن کی قدر دانی اور فن کار کی حوصلہ افزائی قرار دیتا ہے۔

سرافرازی ہو اونٹوں کی گردن تو کاٹئے ان کی

اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہیے

''زبان پر ڈاکہ '' (تیج دہلی کی اس خبر پر کہ مردم شماری میں منشی گوپی ناتھ امن اور پنڈت آنند نرائن ملا کی زبان ہندی لکھی گئی) مال و جائیداد و عزت آبرو پر ڈاکہ پڑتے سنا تھا، زبان پر ڈکیتی اور رہزنی کی مثالیں اب دیکھنے میں آئیں۔

اوپر دی گئی عبدالماجد دریابادی کی طنزیہ تحریروں کی چند مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے طنز نے ان کے انداز تحریر کو منفرد اور ان کی صحافت کو ایک مخصوص طرز کی صحافت بنا دیا تھا، اردو طنزیہ ادب میں عبدالماجد دریابادی کا اپنا ایک مقام اور حیثیت ہے۔

یوں تو عبدالماجد دریابادی کی تمام تحریریں خواہ وہ فلسفیانہ ہوں یا سوانح یا مذہبی اپنے اندر ایک خاص شان رکھتی ہیں لیکن خالصتاً ادبی کارناموں کا بھی ایک قابل لحاظ سرمایہ انھوں نے تخلیق کیا۔ وہ زبان و بیان کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے اور لکھنوی زبان لکھنے پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ وہ ہر موضوع کو زبان کی لطافت اور خیالات کی وسعت کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ وہ یقیناً ایک صاحب طرز ادیب و انشا پرداز تھے۔ پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں :

''دوسرے علمی کارناموں سے قطع نظر مولانا دریابادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔''

ایک بلند پایہ صحافی

عبدالماجد دریابادی کی صحافتی زندگی کا آغاز بچپن سے ہی ہو گیا تھا جب انھوں نے بارہ برس کی عمر میں فرضی نام سے اودھ اخبار میں اپنا مضمون شائع کرایا۔ بقول ان کے پہلے مضمون کا نکلنا تھا کہ "جھجک مٹ گئی اور بہاؤ کھل گیا۔"

اودھ اخبار کے علاوہ ریاض الاخبار ماہنامہ عصر جدید، الندوہ، البشیر، ماہنامہ الناظر اور ادیب نیز دوسرے اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین اور تبصرے کثرت سے شائع ہونے لگے۔ پہلے اپنا نام چھپاتے رہے۔ پھر اپنا نام چھپوانے لگے۔ لکھنؤ سے نکلنے والے روزنامہ ہمدم کے مضمون نگاروں میں وہ شروع سے ہی شامل تھے۔ برج نرائن چکبست کے ماہنامے صبح امید اور سید سلمان ندوی کی ادارت میں شائع ہونے والے معارف میں بھی ان کے مضامین چھپنے لگے۔ ۱۹۱۹ء سے معارف سے باضابطہ تعلق قائم ہو گیا اور کچھ صفحات ان کے لئے مخصوص ہو گئے۔ مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد سے بھی شروع سے ہی تعلق قائم رہا۔ عبدالماجد دریابادی کی باقاعدہ صحافت کی شروعات اخبار سچ کے اجراء سے ہوئی جو جنوری ۱۹۲۵ء سے نکلنا شروع ہوا۔ شروع میں ان کا نام بہ حیثیت شریک ادارت پرچہ کی پیشانی پر آیا لیکن اگست ۱۹۲۵ء سے ظفر الملک کے ہٹ جانے کے بعد وہ اس کے باقاعدہ ایڈیٹر بن گئے۔ اس اخبار نے جلد ہی صحافتی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا۔ "سچ" کچھ مجبوریوں کی وجہ سے بند ہوا تو "صدق" کے نام سے نکلا "صدق" کو بند کرنا پڑا تو "صدق جدید" کے نام سے آخر دم تک نکالتے رہے۔ ناموں کی یہ یکساں تبدیلی بھی عبدالماجد دریابادی کے خداداد ذہن کی دین تھی۔ نام اگرچہ بدلتا رہا لیکن کام تینوں پرچے ایک ہی کرتے رہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک کسی ذاتی اخبار کو کامیابی کے ساتھ نکالنا اور یکساں معیار بر قرار رکھنا ان کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

عبدالماجد دریابادی جس دور میں صحافت کے میدان میں داخل ہوئے تو ان کے معاصر صحافیوں میں ایک سے بڑھ کر ایک حضرات موجود تھے۔ مثال کے طور پر مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، حسرت موہانی، مہاشے کرشن، عبدالمجید سالک۔ منشی دیانرائن نگم جیسے نامور اور باکمال صحافی اپنا سکہ جمائے ہوئے تھے۔

عبدالماجد دریابادی نے ان سب سے الگ اپنی طرز نکالی۔ ان کے پاس قارئین کے لئے ایک پیام تھا۔ سچ کے پہلے شمارہ میں جس لائحہ عمل کا اعلان کیا گیا اس میں پہلا کام اسلامی شریعت کی روشنی میں مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح تھی۔ دوسرا کام ملک کی آزادی کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا تھا۔ غاصب اور ظالم حکومت سے آزادی حاصل کرنے کو مسلمانوں کے لئے فرض ایمان کہا گیا۔ تیسرا کام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اچھے اور خوشگوار تعلقات کو فروغ دینا تھا۔ اسلام اور رواداری سچ کا ایک مستقل عنوان تھا جس کے تحت رسول کی سیرت۔ تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے ایسے واقعات کو اجاگر کرنا تھا جو انسانی بھائی چارہ کو اسلامی طرز زندگی کا بنیادی جز ثابت کرے۔ سچ کی زبان شروع شروع میں اتنی آسان اور سادہ رکھی گئی تھی کہ لوگوں نے اس پر پھبتی کانگریسی اردو" کی کس ڈالی تھی۔

عبدالماجد دریابادی نے اپنا صحافتی نصب العین (MOTTO) اخبار کی پیشانی پر کندہ کر دیا تھا۔ یہ نصب العین قرآن کی ایک آیت "والذی جآء بالصدق وصدق به اولٓئک هم المتقون" (اور وہ جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی پرہیزگار ہیں) سے اخذ کیا گیا تھا۔ وہ عمر بھر اسی پر عمل پیرا رہے۔ اپنے ہفتہ وار میں صرف وہ چھاپتے تھے جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔

صحافت کے بارے میں عبدالماجد دریابادی کا نظریہ کیا تھا؟ اس کو جاننے کے لئے ان کے مضمون "ہفتہ وار صحافت کے آداب" کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس مضمون میں اپنے تجربہ کی روشنی میں انھوں نے صحافت کے مقاصد کا یقین کیا تھا۔ ہفتہ وار صحافت کے آداب عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

۱۔ مقصود خدمت دین وملت رکھئے۔ عام خدمت خلق بھی اس کے تحت آتی ہے۔

۲۔ وطن کا بھی بڑا حق ہے جس طرح پڑوسی کے، استاد کے۔ اور اہل خاندان کے ہوتے ہیں۔ البتہ مسلمان "پرستار" وطن کا نہیں ہو سکتا۔ عبودیت کا یہ خصوصی تعلق تو صرف ذات حق کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے مخلوق میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آسکتا۔

۳۔ خبر برائے خبر کا روزنامہ میں جو بھی درجہ ہو، ہفت روزہ میں تو یہ ایک تقریباً مہمل چیز ہوگی۔ ہفت روزہ میں اپنے تبصرے سے یا کم از کم خبر کی سرخی ہی سے۔ ہر خبر کو بامقصد بنا کر پیش کیجئے۔

۴۔ پبلک کے جذبات کی محض نمائندگی پر ہرگز اکتفانہ کرنا چاہئے۔ پبلک کے مذاق اور جذبات کی

اصلاح کی کوشش کیجئے۔

۵۔ اپنی مقبولیت اور مرجعیت کا خیال کسے نہیں ہوتا؟ ایک حد تک یہ خیال قدرتی ہے لیکن اس جذبہ کو ہمیشہ حدود کے اندر رکھئے اور اپنے اوپر غالب ہرگز نہ آنے دیجئے۔

۶۔ صحافت ایک قسم کی تجارت نہیں بلکہ ایک قسم کی عبادت ہے۔ بس اسی کو نصب العین بنا کر ہمیشہ اپنے سامنے رکھئے۔

۷۔ دوسروں کا احتساب پبلک معاملہ میں ضرور کیجئے لیکن اپنے کو احتساب سے بالا خیال نہ کیجئے۔ احتساب نفس کو سب پر مقدم رکھیے۔

۸۔ بلاوجہ معقول کے۔ کسی کی دل آزاری کیا معنی، دل شکنی کو بھی گوارہ نہ کیجئے اور مروت کے بھی حدود قائم کر لیجئے۔ ان سے آگے قدم نہ رکھئے۔

۹۔ ملک کی اکثریت کا اور حکومت وقت کے قانونوں کا لحاظ ضرور رکھئے۔ حتی الامکان راہ سلامت روی کی اختیار کیجئے لیکن مرعوبیت اور احساس کمتری تک ہرگز نہ پہنچ جایئے۔ صلح جوئی دوسری چیز ہے اور بزدلی اور خوشامد بالکل دوسری۔

۱۰۔ بلاوجہ کسی سے نہ الجھئے نہ خواہ مخواہ تکرار پیدا کیجئے لیکن دوسری طرف دیکھئے اور گرئیے بھی نہیں۔

۱۱۔ پبلک تنقید آزادی سے کیجئے لیکن ذاتیات پر اتر آنے سے اپنے کو اہتمام کے ساتھ بچایئے۔ کسی کے نسب پر، وطن پر۔ یا شکل وصورت پر طنز کرنا سب ذاتیات کی ہی شکلیں ہیں۔

۱۲۔ مزاح، شگفتگی، خوش طبعی علامت شرافت نفس کی اور تفضیح تضحیک اور پھکڑ بازی علامتیں دنائت اور سفلہ پن کی۔ اس فرق عظیم کو ہمیشہ نظر میں رکھئے۔

۱۳۔ آپ بھی بہر حال انسان ہیں اور سارے بشری جذبات رکھنے والے۔ غصہ سے آپ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ایسے موقع پر نفس کو قابو میں رکھنا ہی آپ کی بلند کرداری کی دلیل ہوگی۔

۱۴۔ دیانت کے امتحان بھی اس راہ میں سخت سخت آتے رہتے ہیں۔ اپنے کو بچانے کا اہتمام سامنے رکھئے۔

۱۵۔ غلطی کا امتحان ہر بشر کی طرح آپ کے لئے بھی ہے۔ غلطی کا علم ہو جانے پر اس کے اعتراف سے، اسے واپس لینے سے۔ اس پر معذرت کرنے سے شرمایئے اور جھجکئے نہیں۔

۱۶۔ جس طرح زبان سے نکلی ہوئی ایک ایک بات قابل گرفت ہوتی ہے۔ اسی طرح قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بھی جرح کی ضد میں آسکتا ہے۔ خیال کرتے اور ڈرتے رہئے۔ اس وقت جب آپ کا سارا دفتر آپ کے سامنے ہوگا اور آخری اور حقیقی عدالت میں اس کے ایک ایک لفظ پر

سوال ہو رہا ہو گا۔ صدق جدید، ۲۹ مارچ ۱۹۶۵ء

درج بالا صحافت کے اصولوں پر عبدالماجد دریابادی ثابت قدمی سے قائم رہے۔ ایک اور موقع پر اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا :

"صدق کا مسلک و مزاج اچھا ہے یا برا جیسا کچھ بھی ہے واضح و ظاہر ہے اور حیرت ہے کہ کوئی شخص اس کے چند پرچے بھی پڑھے اور غلط فہمی میں مبتلا رہ جائے۔ وہ سیاسی پرچہ تو کسی معنی میں ہے ہی نہیں۔ اصلاً ایک دینی، اصلاحی، اخلاقی صحیفہ ہے۔ اس کی اصل دعوت ایک دینی واصلاحی دعوت ہے۔ پھر اس کا ایک مخصوص علمی وادبی معیار ہے اور اس کا خاصہ حصہ کتابوں کے نقد و نظر کے لئے وقف رہتا ہے۔ اس سب کے بعد اگر کچھ جگہ بچتی ہے تو وہ سیاسی رائے زنی بھی کر دیتا ہے وہ بھی صرف اپنے ملک سے متعلق جس سے وہ سیاسی۔ آئینی۔ قانونی اور جغرافیائی طور پر وابستہ ہے۔" صدق جدید، ۸ اگست ۱۹۵۸ء

صحافت میں سرخی جمانے کی اہمیت روشن ہے۔ عبدالماجد دریابادی اس فن میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ ان کی سرخیاں اس قدر جاذب توجہ ہوتی تھیں کہ قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی تھیں۔ مثال کے طور پر جب رسالہ ساقی میں ایک قابل اعتراض مضمون شائع ہوا تو عبدالماجد دریابادی نے نہایت دلچسپ سرخی جمائی "ساقی جلوہ دشمنی و آگہی" اور یوں اس مصرعہ کا اطلاق کمال مہارت کے ساتھ ساقی کے خاص شمارہ پر کر دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی ایک مختصر کتاب پر انھوں نے سرخی دی "ذکر حسین ذاکر حسین کی زبان سے" چند اور سرخیوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں "سارے گلے تمام ہوئے ایک جواب میں" "کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے" "دانا کی نادانی" "جدت کی قدامت" "مظلوم کا ظلم" "بلندیوں کی پستیاں" "بزدل سورما"۔

سچی باتیں : عبدالماجد دریابادی کے اخبار کے پہلے صفحہ پر ان کا ادارتی کالم "سچی باتیں" شائع ہوتا تھا۔ یہ کالم برصغیر کے ادبی و صحافتی حلقوں میں بے حد مقبول تھا اور کثرت سے دوسرے اخبارات اور رسائل میں نقل ہوتا تھا "سچی باتیں" کے موضوعات عام زندگی سے لے کر مذہب، اخلاق، تاریخ، سیاست، معاشرت، صحافت، تعلیم سب کچھ ہوتے تھے۔ اس میں دنیا کے ہر خطہ کی بات ہوتی تھی کوئی پہلو نظر آتا تو سچی باتوں میں اس کا ذکر ضرور کرتے اور اس سے سبق لینے کا درس دیتے مثلاً :

"ڈاکٹر کاٹجو موجودہ وزیر اعلا مدھیہ پردیش، معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں الہ آبادہائی کورٹ کے ایک کامیاب ترین ایڈوکیٹ بھی رہ چکے ہیں ایک اپنے تازہ مضمون (مندرجہ لیڈر) میں اپنی پچھلی زندگی کے ذکر میں لکھتے ہیں :

”جب میں سارن پور اس مقدمہ کی پیشی پر پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ فریق ثانی کی طرف سے بحث کرنے والے میرے عزیز ترین دوست تھے لیکن پیشہ کی زندگی میں برابر میرے مخالف ہی۔ ہم دونوں عدالتوں میں ایک دوسرے سے زور آزمائی ہی کرتے نظر آتے تھے۔ نہ صرف ہائی کورٹ میں بلکہ کم وبیش ہر صوبہ میں ایسا قابل، فاضل اپنے فن میں کامل کم ہی میرے دیکھنے میں آیا ہے۔“

”ہے کوئی درس ان ٹھیٹھ دنیاداروں سے ہمارے دین داروں کے لئے۔ ہمارے عالموں فاضلوں سے بھی ممکن ہے کہ کسی دوسرے عالم فاضل کا، جن سے کسی بھی مسئلہ میں اختلاف ہوا ہو۔ ذکر محبت کے ساتھ یا تعظیم واحترام کے لہجہ میں کریں اور اگر کہیں وہ بدنصیب کسی دوسرے فرقہ یا مسلک کا ہے جب تو خیر پوچھیے ہی نہیں۔“ صدق جدید ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۱ء

عبدالماجد دریابادی ”سچی باتوں“ میں اکابرین کے اقوال کثرت سے نقل کرتے تھے اور اس سے ان کا مقصد جذبہ ہم آہنگی کو فروغ دینا ہوتا تھا۔ لکھنؤ کے شیعہ، سنی مناقشہ سے ان کو سخت ذہنی اذیت رہتی تھی اور وہ علمائے سلف کے طور طریق کا ذکر کر کے ان دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کرتے تھے مثلاً :

”قاضی نوراللہ شوستری کو جو مرتبہ و منزلت شیعی دنیا میں حاصل ہے اس سے کون ناواقف ہے، حد یہ ہے کہ شہید ثالث مانے جاتے ہیں۔ یعنی گویا حضرت حسن وحضرت حسین کے بعد انھی کا مرتبہ ہے اور آگرہ میں ان کا مزار شیعان ہند کا سب سے بڑا مرکز اور مرجع ہے۔ ساتھ ہی اہل سنت میں ملا عبدالقادر بدایونی جو مرتبہ وحیثیت رکھتے ہیں اس سے بھی تعلیم یافتہ طبقہ میں کون ناواقف ہے۔ دور اکبری کے مورخ ہونے کے ساتھ ہی اپنے دینی علو، تقشف اور تصلب کے لئے شہرت پائے ہوئے۔ غرض ایک کٹر اپنے عقیدے میں تو دوسرا اتنا ہی اپنے مذہب میں۔ ملا صاحب کی مشہور کتاب منتخب التواریخ تین جلدوں میں ہے جس کی تیسری جلد اکبر کے زمانہ کے اکابر ومشاہیر پر ہے۔ اس میں ملا صاحب کے قلم سے قاضی صاحب کے لئے جو نکلا ہو کم ہی ہے۔ سب، شتم، لعن وطعن سب ہی کچھ ہوگا۔ لیکن دیکھئے سارے قیاس واندازے کے برخلاف واقعۃً ملا صاحب کے قلم سے کیا نکلتا ہے۔ ترجمہ : قاضی نوراللہ شوستری اگرچہ مذہب شیعی رکھتے ہیں لیکن عدل وانصاف، نیک نفسی، حیاداری، پاکبازی کی صفات سے متصف ہیں اور ان میں شریفوں کی خوبیاں جمع ہیں۔ علم وحلم، تیز فہمی، طباعی صفائی قلب وذکاوت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی اچھی اچھی کتابیں ہیں۔“ اور اسی طرح کی سطریں دور تک

لکھتے چلے گئے ہیں۔ کوئی شیعہ دوست اس سے زیادہ اور کیا لکھے گا۔ ایک دوسرے کو نواصب اور روافض کے لقب سے نوازنے والے اور خشونت اور تند مزاجی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے والے اپنے مباحثہ و مناظرہ کو دینی تحقیق کا درجہ دینے والے کیا اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکتے۔" صدق جدید، ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء

عبدالماجد دریابادی نے اپنے اس مشہور و مقبول کالم میں بعض ادبی مسائل پر بھی تفصیلی اظہار خیال کیا۔ مثال کے طور پر اردو شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ تمام تر بدیسی ہے اور اس میں ہندوستانی عناصر بہت کم ہیں انہوں نے اس پر لکھا :

"بت، بت کدہ، دیر، صنم خانہ، کفر، کافر، زنار، قشقہ، برہمن یہ الفاظ آپ نے اپنی شاعری میں، اردو فارسی شاعری میں کثرت اور بڑی کثرت سے پڑھے ہیں یا نہیں۔۔۔۔۔۔ امیر خسرو دہلوی سے لے کر امیر مینائی لکھنوی تک کون اس سے بچا ہے۔ کس نے تخیل کی دنیا میں پائے صنم پر سجدے نہیں کیے۔ کس نے بتوں کی پوجا نہیں کی ہے۔ کس نے اذان دینے کے بجائے ناقوس نہیں بجایا ہے اور کہا یہ جارہا ہے کہ اردو شاعری تمام تر مسلمانوں کی شاعری ہے ہندو تصورات و ہندو تخیلات کو کبھی اس میں منہ نہیں لگایا گیا ہے۔ مسی۔ کاجل، پان، کڑے، انگیا، مہندی، برسات، ساون، کوئل، پپیہا ان سب کو ترکیبوں میں لا لا ان سے مضمون پیدا کر کر اردو شاعری کا جزو شروع سے بنا چلا آرہا ہے یا نہیں۔ یہ چیزیں کیا مسلمان عرب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ سارے تخیلات اس ملک کی پیداوار ہیں یا نہیں۔ حد یہ ہے کہ مرثیہ کی شاعری اور نعتیہ شاعری جو تمام تر مذہبی شاعری کی قسمیں ہیں وہ تک ہندوانہ اور ہندیانہ تشبیہوں اور ترکیبوں سے خالی نہیں۔" صدق جدید، ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء

عبدالماجد دریابادی نے "سچی باتوں" میں فطرت و مناظر فطرت سے حکمت کی کشید کا سامان مہیا کیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس میں خالق کائنات کی برکات کو تخلیقی انداز میں اجاگر کیا گیا ہے :

"زمین خشک، مردہ دبے جان پڑی ہوئی ہے۔ جب آسمان سے پانی برستا ہے۔ اس وقت ہر طرف تازگی و شادابی پھیل جاتی ہے۔ سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ پھول کھلنے لگتے ہیں اور ذرہ ذرہ میں گویا جان پڑ جاتی ہے۔ زمین پر تاریکی چھائی ہوتی ہے۔ ہر چیز اندھیرے کے حجاب میں لپٹی ہوتی ہے۔ جب آسمان پر طلوع آفتاب ہوتا ہے اور اس کی کرنیں زمین پر پہنچتی ہیں تو ہر شے روشن ہو جاتی ہے۔ ہر طرف نور پھیل جاتا ہے۔ کوئی چیز چھپی ہوئی یا دھندلی نہیں رہ جاتی اور ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔" صدق جدید، ۱۰ ستمبر ۱۹۷۱ء

سچی باتوں کے علاوہ عبدالماجد دریابادی نے اپنے اخبار میں ایک اور مستقل کالم "مشورے اور گزارشیں" کے عنوان سے قائم کیا تھا۔ اس کالم میں موجودہ دور کے تغیرات سے پیدا ہونے والے مذہبی اور روحانی اشکالات کے جواب دیے جاتے تھے چونکہ عبدالماجد دریابادی خود اس منزل سے گزر چکے تھے اس لیے وہ جانتے تھے کہ جدید ذہن کی تشفی وتسکین کی کیا موزوں ترین صورت ہو سکتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی صحافت کی ایک اہم خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر اس طرح سے تبصرہ کرتے کہ پہلے نفس خبر عینہٖ نقل کر دیتے اور پھر اس پر مختصر چنے تلے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ صدق اور سچ سے پہلے یہ طریقہ اردو صحافت میں شاید ہی برتا گیا ہو۔

عبدالماجد دریابادی صحافتی دنیا میں بڑے وسیع مطالعہ کے مالک تھے۔ ان کی نظر میں ملکی وغیر ملکی اخبارات ورسائل سب پر رہتی تھی اور ان میں سے اپنے مطلب کی باتیں بڑے جاذب توجہ عنوانات کے ساتھ اخبار میں شائع کرتے تھے اور ان کے مختصر تبصرے ان تراشوں میں برمحل نصائح کے مواقع نکال لیتے تھے۔ انگریزی اخبارات رسائل اور کتابوں سے اخذ واقتباس خود اپنی جگہ علمی ریاضت اور ایک طرح کی ریسرچ ہے۔ ان اقتباسات سے وہ جو نتائج نکالتے اس کا مقصد معاشرہ کی زوال پذیر اقدار کو سنبھالنے کی کوشش ہوتا۔ عبدالماجد دریابادی کی صحافت کی ایک نمایاں خصوصیت مشرقی اقدار وروایات کی ترجمانی کرنا اور مغربی تہذیب وتمدن پر طنز کرنا تھا۔ وہ مغرب کے ساتھ مغرب ہی کے ہتھیاروں سے لڑتے تھے یعنی مغرب کے ہی مصنفین کی تحریروں سے وہاں کے اخلاقی، سماجی اور روحانی مفاسد پر روشنی ڈالتے۔ وہ تلاش کر کے ایسے حقائق اور اعداد وشمار پیش کرتے جس سے مغربی تہذیب جسے وہ یاجوجی تمدن کہتے تھے کی ناکامی، اس کی انسانیت کشی اور انسان دشمنی سامنے آتی۔ وہ مغرب کی برائیوں کو عام نظر کے بجائے محدب شیشے سے دیکھتے لیکن اس کے پیچھے ان کا تمام تر اصلاحی نقطہ نظر ہوتا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں مغرب کی سراسر مادہ پرستانہ تہذیب مشرقی روایات کا گلا نہ گھونٹ دے۔

اس کالم میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ مقصد کی یکسانیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان تمام تحریروں کا مقصد انسانیت کی خدمت اور معاشرہ کی اصلاح نظر آتا ہے۔ وہ اسی جذبہ سے مغلوب ہو کر قلم اٹھاتے اور بات بات میں بڑے پتہ کی بات کہہ جاتے۔ اس کالم میں کبھی قرآن وحدیث کی مشعل ہدایت روشن کی جاتی، کبھی تاریخ کے ابواب سے فیض اٹھایا جاتا۔ کبھی کسی مشہور واقعہ یا تازہ قصہ کو بنیاد بنایا جاتا۔ کبھی معاصرین کے کالموں سے اقتباسات لے کر رائے زنی کی جاتی۔ غرض جہاں بھی کوئی نصیحت آمیز خبر نظر آتی وہ اسے تحریری درس کی شکل دے دیتے۔

عبدالماجد دریابادی کی گہری مذہبیت نے انہیں امن وآشتی کا علم بردار اور بے تعصبی کا پیامبر بنا

دیا تھا۔ وہ مذہبی تعصب سے پاک تھے۔ جس لائحہ عمل کا ذکر کے پہلے شمارہ میں اعلان کیا گیا تھا اسی ڈگر پر صدق بھی چلا اور صدق جدید بھی۔ سچ نے وجود میں آتے ہی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اچھے اور خوشگوار تعلقات کو ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ عبدالماجد دریابادی نے ہندو مسلم نااتفاقی کو از روئے قرآن نامناسب قرار دیا اور لکھا کہ خدا کے جوڑے ہوئے رشتوں کو توڑنا اور کاٹنا، یہی سب سے بڑی گمراہی اور قانون الٰہی میں سب سے بڑی نافرمانی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کا صحافتی کردار ایک مصلح کا کردار ہے۔ وہ اپنے اخبار کے ذریعہ عریانیت، بے حیائی، مغربی تہذیب کی برائیوں، گاندھی جی کی تعلیمات سے بے اعتنائی، اسراف بے جا، ماضی سے بے تعلقی، فرقہ واریت، جنسی بے راہ روی، جدید جرائم، قانون کی بے حرمتی اور بے دینی کے خلاف مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ مثال کے طور پر ایک سگرٹ ساز کمپنی کی اس اطلاع پر کہ لکھنؤ میں ہر سال ساٹھ لاکھ روپیہ کی سگرٹ پی جاتی ہے وہ بے چین ہو اٹھے اور انھوں نے لکھا:

"گویا تمباکو نوشی کی بھی صرف ایک مد سگرٹ نوشی پر ضلع لکھنؤ ۵ لاکھ ماہوار خرچ کرتا ہے۔ بیڑی نوشی، حقہ نوشی وغیرہ کی مدیں سب اس حساب سے خارج ہیں! یہ مفلس ملک، افلاس زدہ گرانی زدہ ملک کے صرف ایک ضلع کا نقشہ ہے! اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اسراف کی اور ساری مدوں، آتشبازی و سینما بینی وغیرہ پر ہر سال ہر ضلع میں، پھر سارے اضلاع میں مل کر کتنا جھونک دیتے ہوں گے۔" (صدق جدید، ۱۸ جولائی ۱۹۵۸ء)

عبدالماجد دریابادی صحافت پر اخلاق و ضمیر کی روشنی ہر حال میں قائم رکھنے کے لیے نہ صرف خواہشمند رہے بلکہ انھوں نے اس کے تحفظ کے لیے بڑے بڑے خطروں اور آزمائشوں کا سامنا کیا۔

عبدالماجد دریابادی صحافت میں سنسنی خیزی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ وہ صحافیوں کی غیر ذمہ دارانہ روش اور خبر لکھنے میں تصدیق کا لحاظ کئے بغیر عجلت سے سخت نالاں رہے۔ انھوں نے صحافیوں کی اس عام روش کے بارہ میں اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا:

"زیادہ نہیں ابھی کوئی تین ہی ہفتہ کی بات ہوگی کہ ایک روز صبح انگریزی اور اردو روزناموں میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خبر جلی اور نمایاں سرخیوں کے ساتھ درج ہے کہ ضلع بروچ (مغربی ہند) کے فلاں گاؤں کے سرپنچ کی بیوی کے سات بچے پیدا ہوئے۔ جڑیوں سے بڑھ کر تین ہی بچوں کی خبر سنسنی خیزی میں کیا کم تھی چہ جائیکہ سات سات بچوں کی یقین نہ آیا لیکن بہر حال اخبار میں چھپی ہوئی خبر تھی، یقین کیسے نہ آتا۔ ابتداءً خبر بروچ کے کسی غیر معروف مقامی پرچہ میں نکلی بس وہیں سے بمبئی کی نامور نیوز ایجنسیاں اسے لے اڑیں اور بمبئی دلی کے روزناموں نے اسے

آل انڈیا نہیں آل ورلڈ اہمیت دے دی اور ملک گیری شہرت آفاق گیر ہو گئی۔ یورپ اور امریکا سے حکم نامے دہلی کے وقائع نگاروں کے نام پہونچے کہ معاً بڑوچ پہونچو اور زچہ اور بچوں کے فوٹو وڈیو تار سے روانہ کرو۔ ٹیلی ویژن کے چار کارکن کیمرے لے لے کر موٹر سے ہوا ہوئے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کچھ ہی دور چل کر موٹر بے کار ہو گئی۔ اس کی پروا کرنے والا کون تھا۔ ہوائی اڈہ قریب ہی تھا اس پر احمد آباد کے لیے اڑے۔ احمد آباد پہونچے تو یہ زمین آسمان نکلی۔ برساتی موسم اتنا خراب کہ احمد آباد اترنا ممکن ہی نہ ہوا۔ جہاز کا رخ بمبئی کی طرف پھیرا۔ یہاں سے جب دم لینے کے لیے ہوٹل پہونچے تو عین اسی وقت پولس ہوٹل پر چھاپہ مار رہی تھی کہ یہاں خفیہ مے نوشی ہوتی ہے۔ میرے شیر کیا ایسی ایسی رکاوٹوں سے کچھ دبنے والے اپنی ہار ماننے والے تھے۔ معاً بجلی ٹرین سے بھاگم بھاگ بڑوچ پہونچے اور اب حقیقت خشک دبے مزہ یہ جا کر کھلی کہ سات بچے ایک جھول میں فلاں اور فلاں وقت پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ سرپنچ صاحب کی دھرم پتنی اب تک سات اولادیں پیدا کر چکی ہیں۔ اسی کو کہتے ہیں۔

لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

جو دوسروں کو جل دینے کے عادی تھے وہ خود کیسا غچہ کھا گئے۔" صدق جدید، ۲ مئی ۱۹۵۸ء

عبدالماجد دریابادی کی صحافت کی نمایاں خصوصیت یہ بھی نظر آتی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی اپنے اندازوں کی غلطی تسلیم کرنے میں جھجک سے کام نہیں لیا، اپنے شخصی وقار کو اس سلسلہ میں در خور اعتنانہ سمجھا۔ اس کی بہترین مثال ان کے وہ مضامین ہیں جو انہوں نے پاکستان میں علاقائی رجحانات کے طاقتور ہو جانے کے بعد لکھے۔ انہوں نے صاف طور پر اعتراف کیا کہ پاکستان کی موجودہ صورت حال ان تصورات کے بالکل مخالف اور برعکس ہے جن کو مد نظر رکھ کر انہوں نے تحریک پاکستان کی تائید کی تھی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں پاکستان کی موجودہ علاقائی کشمکش کو اس جذبہ دین کے یکسر مخالف قرار دیتے ہوئے دکھ اور مایوسی کا اظہار کیا اور لکھا کہ دین کی سربلندی اور اسلام کے تقاضوں اور اصولوں کے تحفظ اور احیاء کا جذبہ تھا جس نے انہیں اور ان جیسے دوسروں کو ایسے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔ یہ ان کی حق آگاہی تھی کہ انہوں نے تقسیم ہند کو بالآخر حکمت کے خلاف سمجھا اور اس سے اتفاق کرنے کو غلط اور اس غلطی کا اعتراف کیا۔ ان کے اس اعتراف نے یقیناً ان کے وقار میں اضافہ کیا۔

عبدالماجد دریابادی کے لیے صحافت پیشہ یا کاروبار نہیں بلکہ عبادت تھی۔ وہ زندگی بھر صحافت کو ایک باوقار اور جرات مندانہ مشغلہ بنائے رہے۔ ان کی پالیسی اور نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے صاحب طرز صحافی ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عبدالماجد دریابادی اور دوسرے اصناف ادب و فن

بحیثیت مکتوب نگار

خطوط انسانی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خطوط کا ادب کو اہم اور مفید حصّہ تسلیم کیا گیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کا شمار ان مکتوب نگاروں میں کیا سکتا ہے جنھوں نے خطوط کے ذریعہ گفتگو کا نعم البدل مہیا کیا اور تحریر و بات چیت کے فاصلے کم کیے۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ ملک و بیرون ملک ان کے بے شمار جاننے والے اور قدر دان موجود تھے۔ چوٹی کے سیاسی لیڈروں اور مشاہیر ادب سے لے کر عام اور معمولی انسان تک ان کو جانتے تھے۔ ملنے ملانے کے سلسلہ میں وہ جتنے محتاط تھے، خط و کتابت کے سلسلہ میں وہ اتنے ہی فیاض تھے۔ ان کو ہر روز ڈاک میں کثرت سے خطوط موصول ہوتے تھے اور وہ خط کا جواب دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کے نظام لوقات میں خط و کتابت کے لیے باقاعدہ وقت مقرر تھا اور انھوں نے اپنی زندگی میں ان گنت خطوط لکھے ۱۹۵۳ء سے انھوں نے اپنے نجی خطوط کی نقلیں باقاعدگی سے رکھوانا شروع کر دی تھیں۔ ان نقل شدہ خطوط کی تعداد مکتوبات ماجدی کے مرتب ڈاکٹر ہاشم قدوائی کے مطابق گیارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

ان خطوط کے مطالعہ سے عبدالماجد دریابادی کے مزاج کردار، میلانات و رجحانات اور سوانحی نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔ ان کے خطوط کے سرمائے میں ہر قسم اور ہر موضوع کے خطوط ملتے ہیں۔ چونکہ عبدالماجد دریابادی کو اپنے دل کی بات قلم سے ادا کرنے پر قدرت حاصل تھی اور ان کی شخصیت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی اس لیے ان کے لکھے ہوئے خطوط دلکشی اور رعنائی کا مرقع بن کر رہ گئے ہیں۔ ان خطوط میں ایک نیک دل، پاک صفات اور بے ریا انسان کے خلوص و صداقت کی ہر جگہ کار فرمائی نظر آتی ہے۔ ذاتی اور خانگی معاملات سے لے کر قومی و ملکی، علمی و ادبی موضوعات تک اس میں ملتے ہیں۔ جہاں تک ان کے خطوط کے

اسلوب بیان کا تعلق ہے اس میں سادگی اور بے تکلفی کی فضا کم و بیش ہر جگہ بر قرار ہے۔

عبدالماجد دریابادی کے خطوط اپنے اندر خاص طرح کی علمی شان لیے ہوئے ہیں خاص طور سے بعض لغاتی مباحث اور لفظی تحقیقات کے ضمن میں انھوں نے بڑی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ لغت کے معاملات پر ان کو خاص دسترس حاصل تھی۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے تعزیتی خط میں لکھا ہے کہ "مولانا کو لغت نویسی سے خاص دلچسپی تھی۔ اگر ان کو دوسرے کاموں سے وقت ملتا تو وہ اکیلے ایک اچھی لغت تیار کر سکتے تھے۔" مولانا عبدالماجد، حیات و خدمات، ص ۷۶

ان کو الفاظ و اصلاحات کی تحقیق کا چسکا ساپڑ گیا تھا اور وہ برابر علمی تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔ ذیل میں ان کے خطوط سے چند ایسے اقتباسات پیش ہیں جن سے ان کے طالب علمانہ مذاق کا اندازہ ہوتا ہے :

(۱) "یہ فرمایئے کہ اودھ پنچ (اوّل) اور فسانہ آزاد میں جو کثرت سے ترکیب یاران سرپل کی آتی ہے یہ ان میں سرپل کی ماہیت کیا ہے اور صحیح تلفظ کیا رکھتا ہے۔ کسی لغت میں اس کا نظر سے گزر نہ یاد نہیں پڑتا۔" مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۲۳

(۲) فسانہ آزاد میں کئی جگہ محاورہ آیا ہے "حکم بس آیا داخل ہے" حکم بس آیا ہی چاہتا ہے کے محل پر "داخل" کا یہ استعمال مجھے نامانوس معلوم ہوا۔

شعر یا غزل لکھنے کے بجائے فعل کہنا تو برابر استعمال میں ہے لیکن اپنے لڑکپن میں مجھے یاد پڑتا ہے یہی فعل کہنا میں نے کتاب کی تصنیف کے لیے بھی سنا ہے۔ مثلاً یہ کتاب کس کی کہی ہوئی ہے۔ ان دونوں محاوروں سے متعلق براہ کرم اپنی تحقیق سے مستفید فرمائیں۔"

مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۲۴

(۳) گنڈا اور غنڈہ کی بحث اگرچہ آپ کے ہاں ختم ہو چکی ہے لیکن اگر مناسب سمجھے تو کسی موقع پر یہ اطلاع بھی اپنے ناظرین کے سامنے لے آیئے کہ ابھی لاہور میں اردو کا ایک تازہ اور مستند لغت ایک لکھنوی اور ایک نیم لکھنوی اور ایک دہلوی تین صاحبوں کا مرتب کیا ہوا اور ڈبل کالم ۱۰۳۸ صفحہ کی ضخامت کا جدید نسیم اللغات اردو کے نام سے نکلا ہے اس کے صفحہ ۸۰۳ کے کالم دوم میں نہ صرف گنڈا بہ معنی لچا، بدمعاش، بدچلن درج ہے بلکہ گنڈی بھی بہ معنی آوارہ عورت۔"

مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۸۰

(۴) آپ کی زبان پر جرمانہ (میم کے ساتھ) یا جربانہ (ب کے ساتھ ہے)؟

مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۱۱۱

اپنے خاص اور بے تکلف دوستوں کے نام خطوط میں عبدالماجد دریابادی نے رعایت لفظی اور

ضلع جگت سے خوب خوب کام لیا ہے جس سے ان کے لکھنوی مزاج کی واضح نشان دہی ہوتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

(۱) ضلع کے اس پورے ملیح آباد کا جواب میرے قلم کی دسترس سے باہر ہے۔

مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۴۷

(۲) آپ کے اشہب قلم نے ضلع کے سبزہ زار میں ماشاء اللہ وہ جولانیاں دکھائی ہیں وہ وہ کلیلیں بھری ہیں وہ وہ کاوے کاٹے ہیں، وہ وہ طرارے بھرے ہیں کہ میری ہمت تو تقلید کی بن نہیں پڑتی۔ اس میدان کے غازی مرد تو آپ ہی ٹھہرے، میرا ابلق خامہ اگر داد کی منہ زوری کا حوصلہ کرے، تو پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے۔ داغ پر داغ اٹھائے۔ ایک ہی گردتی میں درست ہو جائے۔ نعل در آتش ہو کر زبان بند کرتا ہوں۔ قافیہ تنگ ہے زینہار آگے قدم بڑھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اللہ آپ کا کارساز ہے۔ مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۶۹

(۳) "آوارگی" کے پردے میں یہ "روئے آل عبا" خوب چمکی، سبحان اللہ!"

ہماری کم نگاہی تم کہاں تھے ہم کہاں سمجھے

دل نے کہا "فرقہ ملامتیہ" ابھی زندہ ہے۔ مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۹

(۴) "چمار" صاحبزادے کے لیے یہ "شوشو" کا شوشہ آپ نے خوب چھوڑا اور اس ضلع میں ایک بات نوک کی رکھ لی زمانہ کے سر پر ایک ٹھوکر جمادی۔ "داستان کیلو" کا کہنا۔ پڑھنے والے کو چارہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ شروع سے آخر تک ہر شعر پر ہی ہی کرتا رہے۔ رقیبوں حریفوں کے چہرے پر خوب ہی سیاہی مل دی یا "کیلو" کی مناسبت سے یوں کہیے کہ ان کے تابوت میں کیل ٹھونک دی۔ اس بدخط کو سوزن رقم کا خطاب دے کر آپ نے ادھر تو یکسوئی حاصل کر لی ادھر معترض کا گلا ناپ دیا۔" مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۷۴

عبدالماجد دریابادی کے خطوط کی ایک بڑی تعداد تعزیتی خطوط پر مشتمل ہے جو بڑے ہی موثر اور دردانگیز ہیں۔ ان میں ہر قسم کے تعزیتی خطوط شامل ہیں مثلاً والدین کے سایہ سے محروم ہونے پر اولاد کے نام، اولاد کے دنیا سے اٹھنے پر غم زدہ والدین کے نام، بیوی کے غم میں مبتلا عورت کے نام اور رفیقہ حیات کی وفات پر شوہر کے نام، بھائی کی جدائی پر بھائی اور بہن کے نام وغیرہ وغیرہ۔ ان خطوط تعزیت میں اظہار غم و ہمدردی کے ساتھ ساتھ تسکین و تسلی کے وہ پہلو خاص طور سے نمایاں کیے گئے ہیں جو مذہب اسلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ذیل میں ان تعزیتی خطوط کے چند اقتباسات پیش ہیں :

(۱) دیکھتے دیکھتے آج کے دن ہو گئے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو خاک میں دفن کیے ہوئے، نازوں سے

پالے ہوئے نور نظر کو قبر میں اتارے ہوئے۔ اور اللہ کی امانت اللہ کو واپس کیے ہوئے! جس کی جدائی چند گھنٹوں کو بھی گوارانہ تھی اسے یوں نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتے ہوئے کئے دن کیا معنی۔ ہفتوں پر ہفتے سالوں پر سال۔ ساری عمر اس طرح پلک جھپکتے کٹ جائے گی اور پھر ماں باپ کا بلاوا اللہ کی رحمت سے آئے گا تو استقبال کی پیشوائی کو ہاتھوں ہاتھ لینے کو وہی نور نظر موجود ہوگا۔ خون اور کیچڑ میں لت پت نہیں نور کے پانی سے دھلا ہوا، نکھرا ہوا، جنت کی خوشبوؤں میں بسا ہوا۔" مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۱۹۸

(۲) بادشاہت گئی اور آنا فاناً گئی۔ بجلی گری اور یک بیک گری۔ نازوں میں پلی ہوئی شوہر کی ناز برداریوں میں بسی ہوئی خوش نصیب، خوش حال سہاگن دم کی دم میں رانڈ دکھیا ہو کر رہ گئی! آزمائش کڑی آزمائش ہر بیوہ کی ہوتی ہے تمہاری آزمائش اتنی بڑی اور اتنی کڑی کی عجب نہیں فرشتوں کے دل بھی دہل گئے ہوں۔ ایمان اور عقیدے کے امتحان کا اصلی وقت یہی ہے۔ تسکین و تسلی کا سارا یہی ایمان تو ہے۔ یہ نہ بھولنے پائے کہ جس نے یہ وقت ڈالا ہے وہ سب سے زیادہ رحم دل ہے۔ اس کے ہاں سے کسی ظلم کا امکان ہی نہیں۔ خدا جانے اسے کیا کیا درجے تمہیں دینا منظور ہیں۔ آج ان مرتبوں کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۲۳

(۳) ہماری آصفہ تو خوب ہلکی پھلکی اپنے وطن اصلی کو روانہ ہو گئی۔ ہم معمر لوگوں کی طرح بوجھل بننے کا انتظار نہ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اس دنیا میں زیادہ جی کر بجز اس کے حاصل کیا ہے کہ غم و صدمہ ہی روز اور سہنے کو ملیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہلکے پھلکے روانہ ہو جاتے ہیں۔ آں عزیز کے دل کو صدمہ جس درجہ کا بھی پہونچا ہو بالکل قدرتی ہے۔ بیوی اور پھر اچھی بیوی پیاری اور محبوب بیوی زندگی کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے جس کا بدل ممکن نہیں۔ یاد اس مرحومہ کی بات بات پر آئے گی اور خون کے آنسو رلائے گی لیکن خوب یاد رہے کہ اجر بھی ٹھیک اسی درجہ کا ملے گا۔" مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۲۲۱ - ۲۲۰

عبدالماجد دریابادی نے ادب و انشاء میں صحت زبان کو بہت اہمیت دی۔ ان کی تحریریں صحت زبان کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس لیے وہ اپنے معاصرین کے یہاں بھی جب یہ صفت پاتے ہیں تو اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مالک رام کے نام خط میں مسعود حسن رضوی ادیب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی صحت زبان کے بارہ میں لکھتے ہیں :

"وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں ہیں جو اردو صحیح لکھتے ہیں۔ تحریر کی اور بھی خوبیاں ہوتی ہیں۔

فصاحت، بلاغت، سلاست، ظرافت، لطافت، یہ سب اوصاف اضافی ہیں، سب سے مقدم زبان کی صحت ہے۔" مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۹۶

جہاں ایک طرف وہ صحت زبان کی داد کھل کر دیتے وہاں زبان و بیان کی غلطیوں کی نشان دہی کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) "قومی آواز کے بعض لفظ اور ترکیبیں اور ترجمے ایک مدت سے کھٹک رہے ہیں چند بطور نمونہ اس وقت پیش کئے دیتا ہوں جو برجستہ یاد پڑ گئے۔

۱۔ ANY کا ترجمہ بجائے ہر کے "کسی" سے مثلاً اس سرخی میں کہ یو تھانٹ کی کسی بھی تجویز پر غور ہو سکتا ہے

۲۔ غرضیکہ بجائے "غرضکہ"

۳۔ علاوہ بجائے "سوا" کے مثلاً یہ فقرہ کہ صدر کے علاوہ اور سب کھڑے ہوئے"

۴۔ توجہ دی بجائے" توجہ کی"(توجہ دینا تو ایک خاص اصلاح نقشبندیہ کی ہے۔

۵۔ رسمی بجائے باضابطے کے معنی میں (عربی کا رسم اردو کے رسم سے بالکل مختلف ہے)

۶۔ کافی بجائے "بہت" یا بڑا کے مقدار یا تعداد کی زیادتی کے اظہار کے لئے۔

۷۔ آزادانہ FREE کے بجائے خوب خوب یا سخت وغیرہ خوب خوب لیکچربازی ہوئی۔ بڑی مار پڑی۔

۸۔ ممکن ہو سکا بجائے ممکن ہوا یا محض ہو سکا کے۔

۹۔ جرائت مندانہ یا دلیرانہ ڈکیتی کے بجائے بے دردانہ، بے رحمانہ، سفاکانہ

۱۰۔ بدسلوکی کے بجائے بدکاری، بدفعلی، بداطواری کے لئے۔

(مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۱۳۱)

(۲) "آپ کی معارف میں نوٹ کرنے کے قابل کئی باتیں نظر آئیں اور بڑی بات یہ کہ اس کے لئے وقت مل گیا۔

۱۔ صفحہ ۲۴۵ شروع کی سطر ۱۳ اعراف اس معنی میں اردو کے لئے بالکل نامانوس ہے عرف ہی جمع کا کام دیتا ہے

۲۔ املا بہت جگہ اس طرح کا نظر آیا۔ کے لیے کی جاتی ہے مل کر یہ سب بدلنے کے قابل ہے۔

۳۔ صفحہ ۳۴۰ خامہ فرسائی غلط موقع پر استعمال ہوا ہے

۴۔ ”وہ رند بلانوش بھی تھے اور زاہد باصفا بھی۔“ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں تھیں اور آخر وقت تک رہیں۔ اسے یوں لکھا جا سکتا ہے، اگر چہ اب ان کا شمار زاہدان باصفا میں تھا لیکن کبھی رند بلانوش بھی رہ چکے تھے۔“ مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۱۳۷

عبدالماجد دریابادی کے خطوط کا بڑا حصہ ایسا بھی ہے جن انھوں نے بعض تفسیری نکات بیان کئے ہیں۔ یہ خطوط ان کے قرآن اور دین سے گہری وابستگی کے مظہر ہیں۔ اس طرح کے خطوط کی ایک خصوصیت ان کا حقیقت پسندانہ اور مجتہدانہ انداز فکر ہے۔ ان ہی خطوط میں انھوں نے کہیں کہیں مستشرقین کے بارہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

عبدالماجد دریابادی الفاظ کا استعمال کرنے میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی کے الفاظ اردو میں اس طرح استعمال کرتے کہ جدت کا مرقع بن جاتا مثلاً ایک صاحب کو پنیر تحفۃً بھیجنے پر لکھتے ہیں: ”کیا چیز ؟ اس ناچیز کو بھیجی“

شرافت، رکھ رکھاؤ۔ احترام آدمیت اور رواداری وہ قدریں تھیں جو عبدالماجد دریابادی کو از حد عزیز تھیں چنانچہ وہ پریم چند اور علی عباس حسینی دونوں کو ان کی ترقی پسندی کے باوجود اس لئے پسند کرتے تھے کہ دونوں کے یہاں شرافت نفسی بدرجہ اولیٰ موجود تھی وہ لکھتے ہیں۔

” علی عباس حسینی کیا بہ حیثیت انسان اور کیا بہ حیثیت صاحب فن دونوں حیثیتوں سے بڑا امتیاز درجہ رکھتے تھے۔ کہنے کو وہ ترقی پسند تھے لیکن میں کہا کرتا تھا کہ اگر ایسے ہی ترقی پسند سب ہو جائیں تو میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اتنا صاف ستھرا قلم، اتنا شستہ ذوق، اتنی صحیح اور سلیس زبان، گندگی اور بد اطوری سے اتنا گریزاں، ان کے طبقہ میں شاید ہی کسی کے نصیب میں آیا ہو۔ (مکتوبات ماجدی (جلد اول) ص ۱۶۴)

آخر میں چند ایسے اقتباسات پیش ہیں جن سے عبدالماجد دریابادی کی حقیقت پسندی اور صاف گوئی سامنے آتی ہے۔

۱۔ ”حضرت تھانوی کی انتہائی عظمت کے باوجود میرا یہ عقیدہ نہیں کہ ان کی تفسیر کا ہر لفظ قرآن سے متعلق آخری لفظ ہے۔“ (رقعات ماجدی، ص ۱۶۴)

۲۔ ریڈیو دہلی نے حیات شبلی (مصنفہ سید سلیمان ندوی) پر تبصرہ کی فرمائش کی ہے۔ افسوس ہے کہ انتخاب ایسی کتاب کا کیا ہے جو اس بے علم کی نظر میں سید صاحب کی کمزور ترین تصنیف ہے۔

(رقعات ماجدی، ص ۳۵)

۳۔ ابھی پچھلے ہفتہ دھاروار (مغربی ہند) سے ایک غیر معروف صاحب نے ارض القران میں ایک حوالہ کی غلطی لکھ کر بھیجی ہے۔ جوں جوں سن بڑھتا اور تجربہ ہوتا جاتا ہے، بڑی سی بڑی تحقیق کی یہی حقیقت نکلتی جاتی ہے۔" (رقعات ماجدی، ص ۳۴)

عبدالماجد دریابادی کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع تھا، مذاہب عالم خاص طور سے اسلام اور قرآن، حدیث پر نظر کتنی گہری تھی، معاشرہ اور ماحول سے کتنی آگاہی تھی اور ان کا دل کتنا دردمند اور مخلص تھا۔ ان سے عبدالماجد دریابادی کے طالب علمانہ مذاق کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آخر عمر تک برابر علمی تحقیق میں مصروف رہے۔ خطوط میں اشاروں اور کنایوں سے بھی خود پرستی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ عاجزی، انکسار، انسانیت بے نفسی اور انسان دوستی کی فضا ہر خط میں موجود نظر آتی ہے۔ وہ سخت سے سخت مخالف اور معترض کو بھی تہذیب و شائستگی سے جواب دیتے۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا تو ان کی خصوصیت تھی۔ کبھی کبھی تو وہ صرف ایک جملے میں یا ایک چھوٹے سے مصرع میں سب کچھ کہہ جاتے۔ ان کو بات سے بات پیدا کرنے، چھوٹے سے چھوٹے فقروں اور جملوں میں نہایت دلآویزی کے ساتھ پوری بات کہنے میں جو قدرت حاصل تھی اس سے ان کے خطوط ادبی شاہکار بن گئے ہیں۔ ان خطوط میں عبدالماجد دریابادی کا منفرد طرز نگارش اور انشاپردازی کا رنگ و آہنگ نیز رعایت لفظی کا اہتمام پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان خطوط کی ادبیت کی شان نرالی ہے اور ان کی ادبی افادیت مسلم ہے۔

بحیثیت شاعر اور ڈرامہ نگار

عبدالماجد دریابادی کی شعر و سخن سے دلچسپی بچپن سے ہی مزاج میں رچی بسی تھی۔ خود ان کے الفاظ میں:

"شاعری کہیے یا تک بندی اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے شعر جو ادھر ادھر کہیں سن پاتا، یا کہیں پڑھ لیتا بس اکثر ہی یاد ہو جاتے اور انہیں موقع بے موقع پڑھ کر سنا دیتا۔" (آپ بیتی، ص ۳۱۸)

کالج میں آنے کے بعد شاعری سے ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ شبلی کی صحبت میں انکو شعر سمجھنے کا سلیقہ آیا اور وہ سخن فہم بنے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی نے لکھا:

"جس طرح نثر نویسی میں میں نے مولانا (شبلی) کے مقالوں اور کتابوں سے جی بھر کر استفادہ کیا، اسی طرح سخن فہمی میں جو تھوڑی بہت تمیز حاصل ہوئی، وہ مصنف شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کی حاشیہ نشینی سے۔" (آپ بیتی، ص ۳۲۰)

مشہور اور ممتاز شاعر اکبر الہ آبادی کے اصرار سے عبدالماجد دریابادی نے شاعری کے کوچہ

میں قدم رکھا۔ اکبرالہ آبادی کی سخن شناس نظر نے عبدالماجد دریابادی کے اندر شعر گوئی اور شعر فہمی کی صلاحیت کا اندازہ کر لیا تھا کہ یہ نوجوان اگر شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہو جائے تو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہو سکتا ہے۔ وہ زبانی اور خطوط کے ذریعہ برابر عبدالماجد دریابادی کو شاعری کی طرف رغبت دلاتے رہے۔

۱۹۱۳ء میں عبدالماجد دریابادی نے غالب پر ایک مضمون لکھا جو الہ آباد سے نکلنے والے رسالہ ادیب میں شائع ہوا۔ اکبرالہ آبادی کو یہ مضمون بہت پسند آیا اور انہوں نے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد عبدالماجد دریابادی کو لکھا:

"میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں۔ غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔" (فروغ اردو، ص ۲۲۱)

اکبرالہ آبادی کے ان الفاظ نے عبدالماجد دریابادی کو یقیناً متاثر کیا۔ وہ پہلے "غزل گویم یانہ گویم" کی کشمکش میں مبتلا رہے ہوں گے۔ اکبرالہ آبادی جیسے شاعر کی حوصلہ افزائی سے وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت عبدالماجد دریابادی شباب کی منزل میں داخل ہو چکے تھے اور شباب کی ساری توانائیاں مطالعہ و مشاہدہ کی نظر کر رہے تھے اور عشق کا شکار ہو چکے تھے۔ نتیجہ کے طور پر ان پر شاعری کا جذبہ غالب آیا اور وہ غزل کہنے پر مجبور ہو گئے۔

عبدالماجد دریابادی کی شاعری کے پہلے دور کو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کا دور قرار دیا جا سکتا ہے جب انہوں نے غزلیں کہیں۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"۱۹۱۴ء ہی تھا کہ خود بھی غزل گوئی شروع کر دی۔ تازہ و جائز عشق اپنی منگیتر سے پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے محبت کے شاعرانہ جذبات کو بیدار کر دیا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں پر غزلیں کہنے لگا۔" (آپ بیتی، ص ۳۲۱)

عبدالماجد دریابادی نے اپنی غزلیں اکبرالہ آبادی کو اصلاح کی غرض سے بھیجیں اور اکبر نے ان پر حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔ یہ غزلیں انہوں نے ناظر کے تخلص سے لکھی تھیں۔

عبدالماجد دریابادی کی شاعری کا چشمہ تقریباً چار برس تک خشک رہا۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کا نعتیہ کلام پڑھ کر ان کی طبیعت ایک بار پھر بے چین ہو اٹھی اور شعر و شاعری کا جذبہ از سر نو جاگ اٹھا لیکن اب کی شاعری لب و رخسار۔ گل و بلبل۔ زلف و کاکل کی نہیں رہ گئی تھی۔ اب رنگ تمام تر نعت نبی کا غالب تھا۔ اس دوسرے دور کا سلسلہ ۱۹۲۴ء تک چلا۔ اس کے بعد ان کی بے پناہ علمی و ادبی مصروفیات نے انہیں فکر سخن کی فرصت نہ دی اور وہ شاعری سے کنارہ کش ہو گئے۔

عبدالماجد دریابادی کی غزلوں اور نعتیہ غزلوں پر مشتمل مختصر مجموعہ "تغزل ماجدی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

نمونۂ کلام

۱

ان کے انداز میں الفت نہ وفا ہوتی ہے۔
ہاں اگر ہوتی ہے کوئی تو جفا ہوتی ہے
پھر ہے بیتاب زبان عرض تمنا کے لیے۔
دیکھئے دیکھئے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے
کچھ کو کھلنے نہیں دیتی کبھی عصمت تیری
شوخیوں پر بھی تری، مہر حیا ہوتی ہے
مل ہی جاتی ہیں کبھی اپنی نگاہیں ان سے
وہ بھی جب ایسی ہی تقدیر رسا ہوتی ہے
لذت دوصل کے منکر تو نہیں ہم لیکن
لذت کا ہش ہجر اس سے سوا ہوتی ہے
اس نے خود داری ناظر کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

(۲)

مدت ہوئی پاس نزاکت کئے ہوئے
آہ وفغاں سے شور قیامت کئے ہوئے
لودیکھو آگیا نہ زبان پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبط محبت کئے ہوئے
اگلا سا وہ سکون ومتانت کہاں کہ اب
شوریدگی ہے بندۂ وحشت کئے ہوئے
پھرتا ہے پھر نظر میں کسی کا خرام ناز
سامان فتنہائے قیامت کئے ہوئے
وہ دل کہ جلوہ گاہ سرور و نشاط تھا
اب غم ہے اس کو مدفن حسرت کئے ہوئے

یہ عشق دید ہے کہ چلا میں عدو کے گھر
خود داری و غرور سے فرصت کئے ہوئے
پھر دل میں ہے دیکھئے جرأت کا امتحان
انجام کو حوالہ قسمت کئے ہوئے
اب دل میں ولولہ بھی نہیں کوئی ہے کہ ہوں
اندازہ زبونی قسمت کئے ہوئے
بیگانہ وار در پہ کسی کے چلا ہوں پھر
سامان صد مجنتیِ الفت کئے ہوئے
ناظر کے ہوش و عقل اب کہاں دوست
ہے مست اس کو بادۂ الفت کئے ہوئے

(۳)

زینت حسن ہے خود اپنے پہ نازاں ہونا
نازش زخم جگر وہن نمکداں ہونا
عاشقی کیا ہے بجز کشمکش عقل وجنوں
دل کو آفت میں پھنسا آپ ہی حیران ہونا
زندگی اصل میں ہے ایک قفس طائر روح
موت کیا ہے اسی زنداں سے گریزاں ہونا
نامرادی میری ہمزاد تھی، تو کیوں یا رب
میری قسمت میں لکھا صاحب ارماں ہونا
ہم شہیدان وفا موت کے ہیں خود مشتاق
کفر اس شرع میں ہے طالب درماں ہونا
اے اجل آس ہے تیری ہی دم یاس والم
تجھ سے زیبا نہیں انساں کو ہراساں ہونا
راز ہستی وہ گرہ جو کبھی کھل نہ سکی
فلسفی کے لیے آخر ہے پشیماں ہونا

اس جفا کار نے اب کی بھی تو تلافی کیا
اب مقدر میں تو ہے قبر کا مہماں ہونا
میرا انجام دنیا کو اک عبرت کا سبق
دوستو تم نہ کبھی عشق میں غلطاں ہونا
سب کو آخر ہے فنا حسن ہو یا عشق وفا
اہل ہستی، کبھی ہستی پہ نہ نازاں ہونا
لذت درد کے منکر کو سنا دو یہ شعر
ناظر آساں نہیں غالب سا سخنداں ہونا
کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(۴)

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا
ان کو مشغول ستم ان کی جفا نے رکھا
دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا، تیر ہے کیا
اس کو بسمل تیرے انداز وادا نے رکھا
یہ تیرا شعلہ رخ گیسوئے مشکیں سے چھپا
یا چھپا کر مہ تاباں کو گھٹا نے رکھا
ایک دم ہو نہ سکی ہم سے کبھی طاعت حق
ایسا پابند ہمیں حرص وہوا نے رکھا
شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پر کبھی
تجھ کو دھوکے میں تیری شرم وحیا نے رکھا
مرگ وانجام کا بھولے سے نہ بھی آیا خیال
دل کو غفلت میں سدا نشو ونمانے رکھا
کس زباں سے کہئے اپنے تئیں ناظر آزاد
قید الفت میں تو اس زلف دو تا نے رکھا

(۵)

شورش جنوں اب جلوہ دکھلانے کو ہے
یعنی جو کچھ دل میں تھا، سب لب پہ آجانے کو ہے
رخصت اے ضبط و تحمل الوداع اے پاس وضع
بند شوں سے اب زباں آزاد ہوجانے کو ہے
ہوچکی صبر وسکون و خامشی کی انتہا
جام ضبط آہ ونالہ اب چھلک جانے کو ہے
لو مبارک تم کو اے اہل تماشا سپر تو
دست بسمل سے عنان ضبط چھٹ جانے کو ہے
خوب کر مشق جفا، لیکن ستم گر یہ بھی سوچ
کیا وفا کیشی کا جذبہ اس سے مٹ جانے کو ہے
بے ادب لب، ان سے کچھ کہنے کو ہیں پھر مضطرب
ان کے چہرے پر حیا کی پھر جھلک آنے کو ہے
سچ بتا ناظر مسرت تجھ کو اتنی کیوں ہے کیا
ان کی محفل میں کوئی تیری غزل گانے کو ہے

نمونہ نعتیہ کلام

پڑھتا ہوا محشر میں جب صل علیٰ آیا
رحمت کی گھٹا اٹھی اور ابر کرم چھایا
جب وقت پڑا نازک اپنے ہوئے بیگانے
ہاں کام اگر آیا تو نام ترا آیا
یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلی تھی
دم بھر میں ہوا فاسق ابدال کا ہم پایا
چرچے ہیں فرشتوں میں اور رشک ہے زاہد کو
اس شان سے جنت میں شیدائے نبی آیا
ایک عمر کی گمراہی ایک عمر کی سرتابی
جز تیری غلامی کے آخر نہ مفر پایا

حکمت کا سبق چھوڑا، عزت کی طلب چھوڑی
دنیا سے نظر پھیری سب کھو کے تجھے پایا
سمجھے تھے سیہ کاری اپنی ہے فزوں حد سے
دیکھا تو کرم تیرا اس سے بھی سوا پایا
فاسق کی ہے یہ میت، پر ہے تو تیری امت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایا

عبدالماجد دریابادی نے اپنی پہلی غزل کے متعلق یہ اعتراف کیا تھا کہ ان کی طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا اور آخری غزل انہوں نے داغ کے رنگ میں کہی۔ اس کے علاوہ انہوں نے غالب کے رنگ اور زمین میں بھی غزلیں کہی ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کا خاص مقصد ادب کی اصلاح و فلاح تھا۔ وہ اپنے ادبی سرمایہ کی خامیاں دور کرنا اور اس کو ہر اعتبار سے مفید اور جامع بنانا اپنا اولیں فرض سمجھتے تھے۔ یہ مقصد صرف شاعری سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے مختلف علوم و فنون اور موضوعات پر قلم اٹھایا۔ مذہب، فلسفہ، تاریخ، تنقید، سوانح، ڈراما، نفسیات، تحقیق، ترجمہ غرض کوئی ایسا موضوع نہ تھا جس پر انہوں نے توجہ نہ کی ہو۔ ان کی مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئیں کہ ان کو شاعری سے تائب ہونا پڑا۔ قدرت ان سے جو کام لینا چاہتی تھی اس کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ وہ شاعری سے کنارہ کش ہو جائیں۔

نثر کے مقابلہ میں عبدالماجد دریابادی کا شعری سرمایہ اگرچہ نہایت قلیل ہے لیکن اتنا قلیل بھی نہیں کہ اسے یکسر نظر انداز کیا جاسکے۔ اکبرالہ آبادی جیسے ماہر فن نے ان کی غزلوں پر کھل کر داد دی۔ ان کا سرمایہ شاعری مختصر ہونے کے باوجود زبان و بیان، فکر و فن کے اعتبار سے قابل قدر ہے۔ ان کا کلام لطف زبان، شاعرانہ لطافت، حسن الفاظ و ترکیبوں کے بر محل استعمال کی خوبیوں سے ان کو یاد کئے جانے کے قابل بناتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کو صنف ڈرامہ سے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے خود ڈراموں میں حصہ لیا تھا۔ جوانی میں ڈرامہ اور تھیٹر سے اپنی گہری دلچسپی اور شوق کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''مئی ۱۹۱۵ء میں جب آزاد خیالوں کے ساتھ بمبئی میں ایک ہفتہ ہوٹلوں میں رہنا ہوا تھا تو شیکسپیئر اور دوسرے مغربی ڈرامہ نویسوں کے عشق میں کیسی تلاش تھیٹروں اور پلے ہاؤسوں کی

رہتی تھی اور وقت عزیز کا کتنا بڑا حصہ انہیں خرافات میں گزرتا تھا اور عین اسی کو اقتضاء علم ودانش سمجھا جاتا تھا۔" (سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر)

اپنی آپ بیتی میں وہ لکھتے ہیں :

"۱۵ء کی پہلی سہ ماہی تھی کہ وقت کے مشہور ڈرامہ نگار آغاز حشر مع اپنی تھیٹر کمپنی کے لکھنؤ آئے۔ سینما کے بجائے اس وقت اصل زور تھیٹر ہی کا تھا اور میں خود تھیٹر کا بڑا شوقین تھا۔"

(آپ بیتی، ص ۲۸۱)

اس زمانہ میں بمبئی کے سفر دوران ٹرین میں ہی عبدالماجد دریابادی نے ایک ڈرامہ لکھا جو زود پشیماں کے نام سے ماہنامہ الناظر لکھنؤ میں قسط وار چھپا۔ ڈرامہ نگاری چونکہ اس زمانہ میں متانت علم کے منافی تھی اس لیے انہوں نے اپنے نام کے بجائے ناظر کے قلمی نام سے لکھا جو ان کا تخلص بھی تھا۔ بعد کو نظر ثانی و اضافہ کے ساتھ یہ کتابی شکل میں شائع ہوا اور سید سلیمان ندوی، عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا اور سجاد حیدر یلدرم جیسے ممتاز ادیبوں نے اس پر دیباچے لکھے۔ سید سلیمان ندوی نے اس ڈرامہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا۔

"اگر قلت ضخامت و صفحات کوئی عیب نہ ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے بہتر کوئی ڈرامہ علم وفن کی حیثیت سے ہماری زبان میں نہیں لکھا گیا۔"

عبدالماجد دریابادی نے جس وقت یہ ڈرامہ لکھا وہ ان کے الحاد اور عقل پرستی کا زمانہ تھا۔ ان کے تشکیکی اور الحادی خیالات کا عکس اس ڈرامہ میں بھی نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر اس ڈرامہ کا ہیرو یوسف کہتا ہے :

"انسان جوں جوں مرتبہ انسانیت میں ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے اسے جذبات کی قید سے آزاد ہوتے جانا چاہئے۔ دیکھئے انسان کی زندگی حقائق سے کس قدر دور اور وہم پرستیوں میں کس قدر گرفتار رہتی ہے۔ ہوش سنبھالا تو لیجئے عشق و محبت، لیلیٰ مجنوں کے افسانوں سے طبیعت بہلانے لگے۔ کہولت کے دن آئے تو یہ ورق بھی الٹ دیا۔ اب کیا ہے؟ اب بہشت و دوزخ۔ حور و غلماں، جبرائیل و عزرائیل کے چرچے ہو رہے ہیں۔ غرض ساری عمر اسی خرافات پرستی میں گزرتی ہے۔"

چونکہ عبدالماجد دریابادی اسی زمانہ میں عشق و محبت میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اس لیے اس ڈرامہ میں عقل پرستی کے ساتھ ساتھ جذبات کی شوریدہ سری بھی ملتی ہے۔ یہ ڈرامہ انہی جذبات محبت کی یادگار ہے۔ اس ڈرامہ میں اس دور کی تہذیب و معاشرت کے کھوکھلے پن کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ڈرامہ میں "ارباب نشاط" نے بھی حصہ لیا ہے اور حسب موقع رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ کی گئی ہیں۔ اس

ڈرامہ میں بعض حقائق ایسے بھی ہیں جو خود عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔ ڈرامہ کے ہیرو اور ہیروئن یوسف اور حسنیٰ خود عبدالماجد دریابادی اوران کی بیگم عفت النساء کے ہم زاد معلوم ہوتے ہیں۔

جس چیز کو وہ ایک زمانہ میں باعث فخر سمجھتے تھے بعد میں وہی چیز ان کے لیے باعث شرم ٹھری۔ چنانچہ جب جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اردو ڈاکٹر محمد حسن نے ان سے ان کے ڈرامہ زود پشیماں کو اسٹیج کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے جواب میں لکھا:

"زود پشیماں بالکل نوعمری کی تصنیف ہے وہ بھی بڑی حد تک قلم برداشتہ۔ شیکسپیر کا نشہ اس وقت سوار تھا۔ وہ چار کتابیں فن پر الٹی سیدھی پڑھ ڈالی تھیں۔ اب اگر اس کتاب پر نظر ثانی کروں تو پچاس فی صدی بدل ڈالوں۔ ایسی کتاب کو آپ یاد ہی کیوں دلاتے ہیں جس کے ذکر سے شرمندہ ہوا جاتا ہوں۔" (مکتوبات ماجدی جلد اوّل ص ۱۹)

عبدالماجد دریابادی نے اس مشہور ڈرامہ زود پشیماں کے علاوہ "بدسرشت" کے نام سے ایک دوسرا ڈرامہ لکھنا شروع کیا جس کی ایک قسط الناظر ہی میں شائع ہوئی اور چند وجوہات کی بنا پر یہ ڈرامہ مکمل نہ ہو سکا۔ یہ بھی معاشرتی اصلاحی ڈرامہ ہے۔ اس نامکمل ڈرامے کے مکالمات نہایت چست اور کرداروں کی شخصیت کے عکاس ہیں اس نامکمل ڈرامہ کے بعد عبدالماجد دریابادی نے پھر کوئی ڈرامہ نہیں لکھا یا دوسری مصروفیات نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔

بہر حال ان کے تحریر کردہ ڈراموں کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ ڈرامہ کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے ڈراموں میں کرداروں کی پیکر تراشی نہایت خوبصورتی سے کی گئی ہے اور کرداروں کی عادات و خصائل کا خاص خیال انہوں نے رکھا ہے اور ان کی تعمیر میں اعمال و مکالمات سے بھرپور مدد لی ہے۔ اگرچہ ڈرامہ کے میدان میں ان کا چھوڑا ہوا سرمایہ بے حد قلیل ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔

بحیثیت فلسفی و نفسیات داں

فلسفہ سے عبدالماجد دریابادی کو خصوصی دلچسپی تھی۔ کالج کی تعلیم کے دوران انہوں نے فلسفہ کا انتخاب بطور ایک اختیاری مضمون کے کیا تھا۔ فلسفہ کے مضموں کو پسند کرنا ہی ان کے مزاج کی تفکر و تعلق سے وابستگی کا پتہ دیتی ہے۔ وہ حقیقۃً تفکر و تعلق کی وادیوں کے راہ پیما تھے۔

اپنے دور تشکیک والحاد میں عبدالماجد دریابادی نے فلسفہ پر خاص توجہ دی اور اس دور میں ان کا

قلم فلسفیانہ افکار کا ترجمان رہا۔ ان کی فلسفیانہ تحریروں کا زمانہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ جس زمانہ میں انہوں نے فلسفہ نگاری شروع کی اس وقت اردو میں فلسفہ لکھنے کی کوئی مستحکم روایت موجود نہیں تھی اور نہ ہی فلسفیانہ اصطلاحات کی کوئی باضابطہ تشکیل ہوئی تھی۔ ان کو فلسفہ کے باب میں اردو کی کم مائیگی کا شدت سے احساس تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ مغربی فلسفہ کے مشاہیر کے افکار کو اردو میں منتقل کیا جائے چنانچہ جب انہوں نے ماہنامہ الناظر میں اپنا مضمون "فلسفہ اور اس کی ماہیت اور اس کے مذاہب" اشاعت کے لیے بھیجا تو رسالہ کے ایڈیٹر کے نام خط میں لکھا :

"میں چاہتا ہوں کہ اس طرح کے مضامین کا ایک پورا سلسلہ نکالوں جس کے ہر مضمون میں ایک ایک مشہور فلسفی کے مذہب کی تلخیص ہو۔ اس طرح اس سلسلہ کے پورا ہو جانے پر اردو میں تمام اہم مسائل فلسفہ، ایک خاص تفصیل کے ساتھ آجائیں گے۔ یہ کام آپ خوب سمجھ سکتے ہیں آسان نہیں۔ ایک بڑی دقت اصطلاحات علمی کے متعلق ہے۔"

(فلسفیانہ مضامین، ص ۳)

عبدالماجد دریابادی کی فلسفیانہ تحریروں کا پہلا مجموعہ "فلسفیانہ مضامین" ہے جو الناظر کے ایڈیٹر نے ان کی رضامندی کے بغیر شائع کیا۔ بعد میں یہی مضامین چند دیگر مضامین کے اضافہ کے ساتھ اور نظر ثانی کے بعد مبادی فلسفہ کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کتاب میں تیرہ مقالات شامل ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات کا انتخاب اور مسائل کی جانب رویہ عبدالماجد دریابادی کے فکری سفر کی روداد اور اس ذہنی کشمکش کی خاص بڑی حد تک تصویر کشی کرتے ہیں جن سے ان کو دو چار ہونا پڑا تھا۔ ان سارے مضامین میں انہوں نے استدلال سے کام لیا ہے اور اپنی ذہنی کشمکش کا عکس ان پر آنے نہیں دیا ہے۔ صاف شستہ زبان، غیر مبہم انداز بیان اور عالمانہ نثر نے نفس مضامین کو وقار بخشا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ حصہ اول میں انہوں نے امید ظاہر کی تھی کہ :

"ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں کے نصاب میں اب اردو ادب داخل ہو چکا ہے۔ ممکن ہے ان درجوں کے طالب علموں کو سنجیدہ مباحث پر مقالہ نگاری اور مضمون نویسی کی مشق میں اپنے ایک پیشرو کی حقیر کوششوں سے کچھ تھوڑی بہت مدد مل جائے۔"

(فلسفیانہ مضامین، ص ۳)

۱۹۳۱ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو ملک کی ادبی، علمی اور ذہنی فضا آج سے قطعاً مختلف تھی۔ اس وقت کے طلباء نے یقیناً اس سے خوب فیض اٹھایا ہوگا۔ مبادی فلسفہ ایک ایسے دور میں وجود میں آئی جب مذہب فلسفہ تیزی سے بکھر رہا تھا اور مبادی فلسفہ کو اسی نظر سے پڑھنا چاہئے۔ یہ مضامین اسی وقت لکھے

گئے جب تجربی سائنس کی ترقی سے فلسفہ کی دنیا روز بروز سکڑ رہی تھی لیکن فلسفہ سے الگ ہونے والی شاخوں کے بارہ میں اپنے وقت کے اقتباسات سے عبدالماجد دریابادی پوری طرح واقف تھے۔

فلسفہ کے میدان میں عبدالماجد دریابادی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فلسفہ کے بعض دقیق مسائل کو نہایت سلاست سے بیان کر دیا ہے جو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں فلسفہ پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ فلسفہ نگاری میں ان کا طریقہ کار استدلالی ہے۔ وہ نکتہ سے نکتہ اور مسئلہ سے مسئلہ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ بعض فلسفیانہ مضامین میں انہوں نے آغاز ہی ڈرامائی انداز سے کیا ہے۔ چنانچہ قاری کی توجہ شروع سے ہی فلسفیانہ مباحث پر پوری طرح مرکوز ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کی اکثر اصطلاحات کا انہوں نے اردو ترجمہ کیا ہے جس سے ان کی خوش مذاقی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا طرز تحریر فلسفہ جیسے خشک مضمون کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ وہ جس خوبی سے مغرب کے فلسفیوں کے اقوال اپنا لیتے ہیں اور کہیں کہیں حکمائے مشرق کی چاشنی اس میں شامل کر دیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

نفسیات: فلسفہ کی طرح نفسیات سے بھی عبدالماجد دریابادی کو از حد دلچسپی طالب علمی کے زمانہ سے رہی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کو فلسفہ سے بھی زیادہ شغف نفسیات سے تھا۔ نفسیات کے فکری پہلو کے ساتھ ساتھ انہیں اس کے عملی پہلوں سے بھی خاص دلچسپی تھی اور اس ضمن میں عمل تنویم سے ان کو خاص شوق تھا۔ انہوں نے جس زمانہ میں نفسیات پر قلم اٹھایا اس وقت نفسیات فلسفہ کا ہی حصہ سمجھی جاتی تھی اس لیے جہاں ایک طرف ان کی فلسفیانہ تحریروں میں نفسیات کے چند ابواب ملتے ہیں وہیں ان کی نفسیاتی تحریروں کے دوش بدوش فلسفیانہ مباحث بھی ملتے ہیں۔

نفسیات پر عبدالماجد دریابادی کی تحریریں ان کے مجتہدانہ انداز فکر کا پتہ دیتی ہیں ان کی وہ کتابیں جو مشاہیر نفسیات کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر مصنف کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور غور و فکر کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ "فلسفہ جذبات" " فلسفہ اجتماع" اور "سائیکولوجی آف لیڈرشپ" ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں اردو میں اور تیسری انگریزی میں ہے۔ ان کی انگریزی کتاب لندن کے ایک معروف اشاعتی ادارہ نے شائع کی تھی۔ یہ تینوں کتابیں انہوں نے اپنے دور تشکیک میں لکھی تھیں۔

فلسفہ جذبات میں نفسیات کی تعریف، اس کی افادیت۔ اس کی تحصیل کے لزوم، عملی زندگی میں کامیابی کے لیے نفسیات دانی کی ضرورت اور فلسفہ و نفسیات کے تعلق پر دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ چونکہ ان کو عملی نفسیات کی ایک شاخ یعنی تنویم سے خصوصی دلچسپی تھی اس لیے فلسفہ جذبات میں انہوں نے اپنے بعض ذاتی تجربات بھی بیان کئے ہیں جن سے نفسیات کے بارہ میں ان کی نظری کے علاوہ عملی دلچسپی

اور اجتہادی طرز فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے محض مغرب کے افکار کو نقل ہی نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی آرا کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانہ میں نفسیات کے خاص پہلو یعنی فلسفہ جذبات پر لکھتے ہوئے نہ صرف قدیم ماہرین کے خیالات سے اعتنا کیا بلکہ اس زمانہ کے جدید ترین لکھنے والوں کے افکار سے بھی استفادہ کیا۔ اس کتاب کو لکھتے وقت جو اردو میں نفسیات پر پہلی کتاب تھی ان کو زبردست دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ لکھتے ہیں :

> "اس رسالہ کے لکھنے کے لیے جب میں نے قلم اٹھایا تو سب سے بڑی دقت جو راستہ میں حائل ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ نفسیات کے ان مفاہیم کو اردو میں ادا کرنے کے لیے اصطلاحات کہاں سے لاؤں گا؟ اگر اردو میں پیشتر سے کوئی کتاب اس موضوع پر ہوتی تو میرے کام میں یقیناً بہت سہولت پیدا ہو جاتی لیکن مشکل یہ تھی کہ مجھے سفر ہی کرنا نہ تھا بلکہ اپنے ہاتھ سے سڑک بھی بنانی تھی۔" (فلسفیانہ جذبات، ص ۲۱۹)

فلسفہ جذبات کے آخر میں ایک ضمیمہ فرہنگ اصطلاحات کے نام سے بھی درج ہے جس میں عبدالماجد دریابادی کی اختیار کردہ اصطلاحات درج ہیں۔ یہ اصطلاحات اس قدر موزوں اور جامع تھیں کہ آج فلسفہ نفسیات کی کتابوں میں ان میں بیشتر اصطلاحات اپنالی گئی ہیں۔ یہ ان کا زبردست کارنامہ ہے۔

فلسفہ جذبات کی اشاعت کے بعد عبدالماجد دریابادی کی نفسیات پر انگریزی کتاب سائیکولوجی آف لیڈر شپ اور انھی مباحث پر مبنی فلسفہ اجتماع شائع ہوئی فلسفہ قیادت پر ان کی یہ دونوں کتابیں بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئیں۔ انگریزی کتاب پر ہندوستان کے علاوہ انگلستان کے رسائل و جرائد میں بھی موافق اور مخالف دونوں طرح کے تبصرے نکلے داد دینے والوں میں برطانوی صحافت کے ممتاز رکن اور لندن ٹائمز کے شعبہ خارجہ کے مدیر اعلیٰ سر ویلینٹائن چرول بھی شامل تھے۔ اس کتاب کے دیباچے میں عبدالماجد دریابادی نے دعویٰ کیا ہے کہ زیر نظر کتاب کے تمام مباحث کی خود مصنف نے مشاہدے اور آزاد شہادتوں کی بنا پر تصدیق کی ہے۔ انھوں نے اپنی اس تصنیف میں قائدین اور عوام کے متعلقہ فرائض در اعمال پر تفصیلی بحث کی ہے اور عوام کے عقائد و آرا کی تبدیلی و تاثر پذیری، عوام اور قائد کے فرق، قائد اور قربانی کا رشتہ، قیادت کا جوہر اصلی، سچے قائد کا حکیمانہ ادراک، شعور اور نفسیاتی بصیرت اور قائد و زعیم جیسے موضوعات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

فلسفہ اجتماع میں شامل مذہبی اعتبار سے سخت قابل اعتراض مواد کی موجودگی کی بنا پر عبدالماجد دریابادی پر بڑی لے دے ہوئی اور مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ان کی تکفیر کا فتویٰ تک دے دیا۔ بعد میں جب وہ تشکیک والحاد سے مذہب کی طرف لوٹے تو انھوں نے فلسفہ اجتماع کو جس پر وہ ایک زمانہ میں فخر

کیا کرتے تھے نہ صرف اپنی تصانیف کی فہرست سے خارج کر دیا بلکہ اس کی ہر طرح کی اشاعت بھی رکوادی حالانکہ اس کتاب پر مخالفت کے ساتھ ساتھ انھیں داد بھی بہت ملی تھی۔ جب انھیں اس بات کا علم ہوا کہ کشمیر یونیورسٹی نے اس کتاب کو اپنے ہاں کے امتحان ادیب فاضل کے نصاب اردو میں داخل کر رکھا ہے تو انھوں نے کشمیر یونیورسٹی سے اس پر پر زور احتجاج کرتے ہوئے لکھا:

"کتاب علاوہ دوسرے پہلوؤں کے ادبی اعتبار سے بھی ادیب فاضل کے نصاب میں رکھے جانے کے قابل نہیں۔ اس کی انشاء اب اپنے لیے باعث ننگ سمجھتا ہوں۔"

صدق جدید، ۲۲ جولائی ۱۹۵۵ء

فلسفہ اجتماع کے بعد ایک طویل عرصہ تک عبدالماجد دریابادی نے فلسفہ و نفسیات پر قلم نہیں اٹھایا۔ ۱۹۴۲ء میں ایک بار پھر انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوع یعنی نفسیات کی طرف توجہ کی جس کے نتیجہ میں پاپولر نفسیات پر مبنی کتاب "ہم آپ" وجود میں آئی۔ اس کتاب میں بھی ترجمانی سائیکولوجی کے اس دور کی ملتی ہے جب وہ سائنس کی نہیں بلکہ فلسفہ کی شاخ تھی اس کتاب میں مصنف کی گہری باطنی تبدیلی کے نقوش جابجا دیکھے جا سکتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کا مخصوص اسلوب تحریر جس میں مختلف ابواب کی تمہید کا ڈرامائی انداز خصوصی اہمیت رکھتا ہے بھی جگہ جگہ جھلکتا ہے جس نے "ہم آپ" کو نہایت دلچسپ بنادیا ہے اس میں نفسیاتی بصیرت افروزی کے متعدد مقامات ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"نیک نامی کو جماعت عطیہ وانعام سمجھتی ہے۔ وہ فرد کی اس جسارت کو معاف نہیں کر سکتی کہ اس نے جماعت سے بے نیاز ہو کر یا اس کے فیصلہ کا انتظار کئے بغیر اس انعام کو اپنے لیے مخصوص کر لیا اور سوسائٹی ایسے افراد کو سزا یہ دیتی ہے کہ اس کا نام خود بین، خود نما، خود پرست رکھ دیتی ہے۔" (ہم آپ، ص ۱۸۲)

"ہم آپ" میں بیشتر موضوعات کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر کی مصطلحات نفسیات کے اندراج سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

عبدالماجد دریابادی کی فلسفہ و نفسیات سے متعلق تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفہ و نفسیات سے ان کے دل و دماغ کو گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے جس دور میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا اس وقت اردو میں ان موضوعات پر مواد بہت کم تھا اور جو کچھ تھا بھی اس میں بیشتر حصہ ترجمہ کا تھا۔ عبدالماجد دریابادی نے نہایت جانفشانی اور قابلیت سے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں انھوں نے ایک ایسے فلسفی مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کی جس نے جدید فلسفہ خصوصاً اس کی شاخ نفسیات ...

مضامین کو اردو میں ابتدائی انشا پردازانہ رنگ میں منتقل کیا۔ انھوں نے اہم کتابوں کا نہ صرف غیر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا بلکہ خود بھی مستقل کتابیں لکھیں۔ اس میدان میں ان کی دو بڑی خصوصیتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا مطالعہ نہایت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کا طرز تحریر فلسفیانہ مسائل کو دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے لیے خاص طور پر موزوں تھا۔ وہ فلسفی نہیں بلکہ مفسر فلسفہ تھے۔ ان کا قلم فلسفیانہ افکار کا ترجمان رہا لیکن شرح و ترجمہ کے ساتھ انھوں نے خود اپنی ذاتی فلسفیانہ افکار بھی اردو ادب کو دیے ہیں۔ فلسفہ اور نفسیات کے شعبہ میں انھوں نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ یقیناً ناقابل فراموش ہیں اور ان کی اختیار کردہ اصطلاحیں ان کا ایسا کارنامہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بحیثیت ترجمہ نگار

عبدالماجد دریابادی کو ترجمہ سے طبعی مناسبت تھی۔ وہ الفاظ و اصطلاحات کے محل استعمال سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ ایک ہی لفظ مختلف مواقع پر مختلف معانی دیتا ہے۔ اس باب میں ان کا لسانی پس منظر ان کی مدد کرتا تھا۔ وہ عربی، فارسی اور اردو سے بخوبی واقف تھے اور انگریزی پر اطمینان بخش دسترس رکھتے تھے، علامہ شبلی ان کی مہارت ترجمہ کے قائل تھے۔ شبلی نے ۱۶ مئی ۱۹۱۴ء کے ایک خط میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی کو لکھا تھا : " تولدکی کا ترجمہ میرے پاس موجود تھا تاہم آپ پورا کر دیجئے۔ آپ کا ترجمہ قابل سند ہوگا۔" (خطوط مشاہیر جلد اول، ص ۲)

عبدالماجد دریابادی کا ترجمہ کے بارہ میں کیا نظریہ تھا وہ خود ان ہی کے الفاظ میں سنئے :

"ترجمہ میں اگر پابندی زبان ترجموں کے طریقوں، ترکیبوں، محاروں اور روز مرہ کی رکھیے تو یہ اپنا ہوا، ترجمہ کرنا نہ ہوا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ترجمانی کہہ لیجیے۔ اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھنے کا کر لیا اور تکیہ تمام تر لغت کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ و بے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدمزہ ہو کر رہے گی۔"

(مقدمہ تفسیر ماجدی)

جہاں تک عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ کے طریقہ کار کا تعلق ہے اس کے بارہ میں انھوں نے لکھا ہے :

"میرے ترجمہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے پوری کتاب پڑھ ڈالتا۔ اس کے بعد ایک ایک باب پڑھتا۔ تیسری مرتبہ دو صفحہ، تین صفحہ، غرض اتنا پڑھ لیتا جتنا ترجمہ اس دن مقصود ہوتا۔ چوتھی بار

ایک پیراگراف پڑھتا۔ اس طرح مطلب و معنی پر پورا عبور ہو جاتا اور پھر قلم برداشتہ ترجمہ کرڈالتا۔" (آپ بیتی، ص ۲۷۹)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ترجمہ کرنے سے قبل کسی کتاب کو متعدد بار پڑھتے اور مطالب و معانی پر عبور حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اپنی تصنیفی و تالیفی زندگی کے ابتدائی دور میں عبدالماجد دریابادی کا زیادہ تر زور قلم فلسفہ و منطق اور دیگر سماجی علوم کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے پر صرف ہوا۔ اس قسم کے موضوعات پر قلم اٹھانے والوں کو سب سے بڑی دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب موزوں اصطلاحات اور مناسب الفاظ کی تلاش میں ان کی زبان کی تنگ دامانی قدم قدم پر ان کی راہ روکنا شروع کر دیتی ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے ترجمہ اس دور میں شروع کیا جب اردو میں ترجمے کی کوئی مستحکم روایت موجود نہیں تھی اور علمی و فلسفیانہ اصطلاحات خام حالت میں تھیں۔ عبدالماجد دریابادی کو اس باب میں اردو کی کم مائیگی احساس تھا اور اس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

" ایک بڑی دقت اصطلاحات علمی کے متعلق ہے۔ نئی اصطلاح کے وضع کرتے وقت اگر کوئی معمولی سا اردو کا لفظ رکھیے تو وہ اصطلاحی شان نہیں رکھتا، اس میں سوقیت نظر آتی ہے اور اگر کوئی عربی کا لفظ تلاش کر کے لائیے تو وہ کانوں کو نامانوس معلوم ہوتا ہے۔" (مقدمہ تفسیر ماجدی)

عبدالماجد دریابادی نے اصطلاحات کے لئے عربی متبادلات کا سہارا لیا، کہیں اپنے پیشرو مترجمین کی بعض اصطلاحات کو قبول کیا اور کہیں خود اصطلاحات وضع کیں۔

عبدالماجد دریابادی کے تراجم کی شروعات ۱۹۱۱ء سے ہوئی جب ان کے ترجمے "الندوہ" میں شائع ہوئے۔ انھوں نے فلسفہ، سائنس تہذیب و تمدن، عمرانیات اور حدیثیات جیسے موضوعات پر اہم کتابوں کے ترجمے کئے۔ ان ترجموں اور ان کے اسالیب میں تنوع نظر آتا ہے۔ انھوں نے کہیں اصل متن کا لفظی ترجمہ کیا، کہیں مخلص ترجمہ سے کام لیا، کہیں ترجمہ تالیف کی شکل میں ڈھل گیا اور کہیں مختصر تشریح و تفسیر سے بھی کام لیا۔

خالص ترجموں کی فہرست میں "مکالمات برکلے" ان کے ترجمہ کے فن میں مہارت کی مثال ہے۔ مکالمات کے دیباچے میں عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ

"ترجمہ مکالمات میں حتی الامکان لفظی پابندی ملحوظ رکھی گئی ہے لیکن نہ اس حد تک کہ کتاب چیستاں ہو جائے۔"

اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے مکالماتی فضا کو برقرار رکھا ہے۔ زبان کے لطیف بیان کو خوبی سے اردو میں منتقل کیا ہے اور اصل متن میں شامل انشاپردازی کے چٹخارے کو بخوبی قائم رکھا

ہے۔ مکالمات برکلے کا ترجمہ کرتے وقت وہ برکلے کے ذہن وذوق اور اس کے خیالات و میلانات سے پوری طرح واقف نظر آتے ہیں اور اس لئے وہ اس قدر کامیاب ترجمہ کرپائے۔ مکالمات برکلے کے ذیل میں ان کی مہارت ترجمہ کی داد دیتے ہوئے پروفیسر اعجاز حسین نے درست لکھا کہ "عبدالماجد دریابادی نے اس ترجمہ میں علاوہ اوربا توں کے زبان اور طرز بیان کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی مناسب مقامات پر دیتے ہوئے مضامین کی دشوار گزار راہوں سے بھی نہایت خوبی سے گزر گئے ہیں۔" (فروغ اردو)

خالص ترجموں کی فہرست میں ان کی اگلی کتاب "ناموران سائنس" ہے۔ اس ترجمہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر سرے سے ترجمے کا نہیں بلکہ طبع زاد تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انھوں نے اصل کے عناصر کو نہایت خوبی سے ترجمے میں سمیٹ لیا ہے جو ترجمہ کے فن میں ان کے ماہر ہونے کا ثبوت ہے۔ خالص تراجم کے ذیل میں آخری ترجمہ قران کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ جدید انگریزی میں ہے۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ عبدالماجد دریابادی نے کسی لفظ یا حرف کو چھوڑا نہیں ہے۔ قرآنی متن کی مطلوبہ پابندی بھی برتی ہے اور ایجاز واختصار سے کام لے کر قرآنی اسلوب کا تتبع کیا ہے۔

ملخص تراجم کے ذیل میں عبدالماجد دریابادی نے تاریخ اخلاق یورپ تاریخ تمدن، منطق استخراجی واستقرائی اور پیام امن شامل ہیں۔ یہ تمام ترجمے انگریزی سے اردو میں کئے گئے اول الذکر دونوں کتابوں کے صرف مفہوم و معانی کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کیا ہے، لفظی ترجمہ نہیں کیا۔ اس بات کی صراحت انھوں نے تاریخ اخلاق یورپ کے دیباچے میں بھی کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

" ترجمہ کو صحیح معنوں میں ترجمہ کہنا درست نہیں اس لئے کہ اس میں مصنف کے الفاظ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی' صرف اس کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر اس کے اصل خیال کو اردو میں ادا کر دیا گیا ہے "

انھوں نے مطلب کی مزید توضیح کے لیے بعض جگہ اشعار کا بھی سہارا بھی لیا ہے مثلاً لذتیت کے فلسفہ امروز کو بیان کرنے کے لیے انھوں نے شعر آج تو چین سے گزرتی ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے کا بر محل استعمال کر کے ترجمانی کی تاثیر بڑھادی ہے۔ جہاں تک "تاریخ تمدن" کا سوال ہے اس کتاب کے ترجمے کے متعلق انھوں نے لکھا ہے۔" اس کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ ایک اور صاحب کر کے وفات پا چکے تھے، باقی کا تکملہ میں نے کیا۔" اس میں بھی انھوں نے مصنف کے افکار وخیالات کی کامیاب ترجمانی کر دی ہے۔ ملخص تراجم کے سلسلہ میں ایک اور کتاب منطق استخراجی واستقرائی ہے۔ اس کے دیباچہ میں عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے :

" پروفیسر پی کے رے کی " ٹکسٹ بک آف ڈیڈکٹیو لاجک " ایک مشہور درسی کتاب ہے جو

ہندوستان کے اکثر کالجوں میں زیر درس رہتی ہے۔ اس کا ایک ترجمہ عرصہ ہوا پنجاب یونیورسٹی نے شائع کر دیا تھا۔ موجودہ کتاب بھی اس کا ترجمہ ہے لیکن اس ترجمہ کو تالیف کہنا زیادہ قرین صحت ہوگا اس لیے کہ :

۱۔ اس میں لفظی ترجمہ کی پابندی ایک مقام پر بھی نہیں کی گئی ہے بلکہ مصنف کے مطالب کو اردو میں ادا کر دیا گیا ہے۔

۲۔ بہت سا حصہ جو مبتدیوں کے لیے غیر ضروری معلوم ہوا حذف کر دیا گیا۔

۳۔ بعض مثالیں نئی اضافہ کر دی گئی ہیں۔"

مخلص ترجموں میں ایک اہم کتاب 'پیام امن' ہے۔ یہ کتاب موسیو پال رچرڈ نے فرنچ زبان میں لکھی اور امریکہ سے انگریزی میں "TO THE NATI ONS" کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے اس کے انگریزی ایڈیشن کا ملخص انگریزی میں لکھا تھا جو ترجمہ ہو کر فلسفۂ امن کے عنوان سے رسالہ معارف میں شائع ہوا اور ٹیگور جیسے ادیب شہیر نے اس کا دیباچہ لکھا۔ گاندھی جی کا ملخص اور عبدالماجد دریابادی کا ترجمہ کم و بیش ایک ہی زمانہ میں مکمل ہوئے۔ عبدالماجد دریابادی نے اس ترجمہ کے بارہ میں لکھا ہے کہ "اسے ترجمہ سے زیادہ تالیف کہنا مناسب ہوگا"۔ یہ بات یقیناً درست ہے کیونکہ انھوں نے بعض مسائل کے سلسلہ میں مصنف سے تفصیلاً اختلاف کیا ہے۔ ان کے پیام امن پر مفصل تبصرہ پر علامہ اقبال نے اس کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا: "آپ کا تبصرہ بجائے خود ایک مفید رسالہ ہے۔" عبدالماجد دریابادی نے مصنف کے جوش بیان اور خطابیہ لہجہ کو اردو میں نہایت خوبی سے سمویا ہے اس میں پابندی اردو زمرہ کی گئی ہے۔ اس وجہ سے ترجمہ میں تخلیق کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ ترجمہ میں ایجاز کی خوبی کو قائم رکھا گیا ہے۔ دینی موضوعات سے متعلق کتابیں جس میں عبدالماجد دریابادی نے جدید اسلوب نثر اور تازہ طرز احساس کے حوالے سے ترجمہ و تشریح کا فریضہ انجام دیا ہے ان میں مناجات مقبول اور چہل حدیث ولی اللّٰہی شامل ہیں۔

کتابوں کے علاوہ عبدالماجد دریابادی نے متعدد مضامین کے بھی ملخص ترجمے کیے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے جن میں اہم ترین مل کا مضمون "تمدن" ہے۔

ترجمہ کا نمونہ

مناسب نہ ہوگا اگر عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ کا ایک نمونہ پیش کر دیا جائے۔ درج ذیل ٹکڑا تاریخ تمدن سے لیا گیا ہے :

"حقیقت یہ ہے کہ بغیر برک کے تذکرہ کے جارج سوم کے عہد کی تاریخ سرسری طور پر بھی مکمل نہیں کی جاسکتی۔ یہ عجیب و غریب شخص نہ صرف سیاست کے اصول و فروع پر حاوی تھا بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ جملہ علوم فنون کی ایک زندہ دائرۃ المعارف تھا۔ اس کے بڑے بڑے نامور معاصرین اس کے کمالات کی جامعیت کے قائل تھے اور ہمیں تو رابرٹ ہال کا یہ قول حرف بہ حرف سچ معلوم ہوتا ہے۔" برک کے کمالات لاتعد اد ولا تحصی تھے۔ اس کا دماغ عامۃ الورود تھا اور وہ ہر علم و فن سے بہرہ رکھتا تھا۔" قانون و فنون لطیفہ بظاہر باہم متناقص نظر آتے ہیں لیکن برک کی ذات ان دونوں کی جامع تھی چنانچہ جہاں ایک طرف وکلا و مقننین کی جماعت اسے پیر مرشد مانتی ہے وہاں دوسری طرف اہل کناعت بھی اسے اپنا ہادی و رہبر تسلیم کرتے تھے تاریخ و علم السنہ کو ہم بالکل جدید علم سمجھتے ہیں لیکن برک ان علوم میں امام کا درجہ رکھتا تھا۔

ایک عرصہ تک ترجمہ نگاری سے مسلسل سابقہ کی بنا پر عبدالماجد دریابادی کو الفاظ و اصطلاحات کی تحقیق کا چسکا سا پڑ گیا تھا چنانچہ اپنے مخصوص دائرہ کار کے باہر بھی جب کوئی نامانوس لفظ یا نئی اصطلاح ان کے سامنے آتی تو وہ اس کے محل استعمال و ہیئت و معنویت پر غور کرتے۔

عبدالماجد دریابادی کے مختلف النوع تراجم سے اردو کے اسالیب بیان میں یقیناً اضافہ ہوا۔ انھوں نے فلسفہ، نفسیات، دینیات، قرآنیات اور عمرانیات کے ترجمہ و توضیح سے اردو کے اظہار کے سانچوں کو وسعت دی اور اس کے رقبے کو وسیع کیا۔ انھوں نے ترجمہ میں نثر کے محاسن کو بڑی مہارت سے جگہ دی۔ ان کا ترجمہ فصیح و بلیغ با محاورہ روزمرہ اور سلاست و سادگی کی خوبیوں کا جامع ہے۔ ان کے ترجموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اصل کی روح کو کامیابی سے ترجمہ میں منتقل کیا اور نہ صرف مفہوم بلکہ اسلوب کو بھی برقرار رکھا۔ انھوں نے بعض اصطلاحات خود وضع کیں اور ترجمہ نگاری کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو مالا مال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

بحیثیت مقدمہ نگار اور تبصرہ نگار

عبدالماجد دریابادی نے بے شمار کتابوں کے مقدمات لکھے اور اس سے بھی زیادہ کتابوں پر تبصرے کیے۔ ان کے مقدمات اور تبصرے ادب و صحافت کے باب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تحریروں میں ان کا مخصوص اسلوب تحریر اور اسلوب نقد پوری طرح جھلکتا ہے۔

جہاں تک مقدمہ نگاری کا تعلق ہے عبدالماجد دریابادی نے شاعری، تاریخ، ناول، سیرت و سوانح، سیر و سیاحت، انشائے لطیف اور خاکہ نگاری کی کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں۔ ان سے ان کے یہاں

تنوع کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ان سے ان کے تصورادب وشعر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :

" اردو میں میری پسند کے شاعر ایک دو نہیں بلا مبالغہ بیسیوں کی تعداد میں ہیں لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ جنگل بیابان میں جاکر کہیں معتکف ہو جاؤ اور اپنے ساتھ کسی ایک اردو شاعر کا دیوان لے جاسکتے ہو تو میں اس دفتر بے پایاں سے انتخاب صرف ایک دیوان غالب کا کروں گا اور اپنے ہر ذوق کی تسکین اس ایک حکمت، معرفت، شوخی، ظرافت، سوزو گداز، رفعت تخیل و حسن تعلیل کے مجموعہ سے کرلوں گا۔"

(غالب کے کلام میں الحاقی عناصر از نادم سیتا پوری)

ایک دوسرا اقتباس :

" ان امرا و اہل ریاست کا کھانا پینا رہنا سہنا سونا سانا جاگنا، ان کی مسرت و غم، ان کی محبت ونفرت ان

کے شوق و دلچسپیاں، ان کے عیش منانے کے طریقے ان کے ہاں ولادت اور موت کے وقت کی رسمیں، ان کی بخششیں اور فیاضیاں ان کے جور وستم و جلادیاں، ان کی عبادتیں، ان کی ضیافتیں، ان کے صبح شام غرض ان کی زندگی کے چھوٹے بڑے سارے ہی شعبے ہم عامۃ الناس کے لیے ! عجوبہ ہی کا حکم رکھتے ہیں۔ ہم دیکھیں تو حیرت کریں، سنیں تو یقین کرنے پر طبیعت آمادہ نہ ہو۔ ضرورت اور بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ان سرکاروں، درباروں میں رہ کر، ان کے اندر چل پھر کر، ان کی خلوت اور جلوت میں رسائی حاصل کر کے، ان کی عکاسی کاغذ کے صفحات پر کر کے دوسروں کو بھی ان جلوؤں کی سیر میں شریک کرے۔ دو شرطیں ایسے اہل قلم کے لیے لازمی ہیں، ایک یہ کہ اُسے اپنے موضوع پر عبور حاصل ہو اور وہ صحیح معنوں میں گھر کا بھیدی ہو۔ محض اٹکل پچو۔ سنی سنائی پر عمارت کھڑی کر دینے والا نہ ہو۔ دوسری یہ کہ جو کچھ بھی لکھے اپنے علم و یقین کے مطابق سچ ہی سچ لکھے۔ مبالغہ نہ مدح میں کرے نہ قدح میں۔ مقصد محض واقعہ نگاری ہو نہ کہ ہجو یا تحسین۔" (دربار دربار از صدق جائسی)

درج بالا اقتباسات سے عبد الماجد دریابادی کے تصور شعر وادب پر روشنی پڑتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ان کا سیرت و سوانح کا تصور نہایت جامع اور ہمہ گیر تھا۔ مقدمات میں وہ متن سے مثالیں کثرت سے پیش کرتے ہیں۔ ادیب اور اس کے عہد کے پس منظر کا اجمالی ذکر کرتے ہیں اور اپنے قلم کا جادو جگاتے ہیں۔ مقدمات کی طرح عبد الماجد دریابادی کے تبصروں کا دائرہ بھی مذہبی، تاریخی، ادبی، افسانوی،

علمی وفکری، سوانحی و تنقیدی کتب تک پھیلا نظر آتا ہے۔ ان کے تبصرے صرف کتابوں پر رسمی تبصرے نہیں بلکہ ان میں ایک تخلیقی شان بھی نظر آتی ہے۔ تبصرہ کرتے ہوئے وہ نہایت گہری اور پتہ کی بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کی تبصرہ نگاری کی امتیازی خصوصیت ان کا بے تکلف انداز ہے۔ وہ اشعار یا نثر سے جس طرح محظوظ ہوتے ہیں اس کا اظہار اپنے تبصرے میں کر دیتے ہیں۔ ایک تبصرہ کے اقتباسات بطور مثال ملاحظہ ہوں:

> نقد و نظر پر تبصرہ کرنے کے لیے خود بڑے صاحب بصیرت ہونے کی ضرورت ہے لیکن سر سے آنکھ چرانا بھی بڑی بے بصری ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک ایک مشرقی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مشرقی طالبان فن کے لیے اور مشرقی عام ناظرین کے لیے۔ قادری صاحب یہ نہیں کہ ہومر اور درجل کے ناموں سے نا آشنا ہوں۔ وہ واقف بائرن اور شیلے سب سے ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی سے مرعوب نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اپنے دل و دماغ سے لکھتے ہیں۔ اور اپنوں کے لیے لکھتے ہیں۔۔۔۔ البتہ ناواقف ایک فن سے ہیں۔ انہیں یہ نہیں آتا کہ اپنے افلاس دماغی پر پردہ پر شوکت اور مرعوب کن ناموں کا ڈالیں۔ یہ حیثیت مجموعی اتنی سلجھی ہوئی، سنبھلی ہوئی، سموئی ہوئی کتاب فن تنقید پر اردو میں عرصہ کے بعد دیکھنے میں آئی جب طبیعت دوسرے رنگ کی تنقیدی کتابوں سے اکتا چکی۔"

(مقالات ماجد، ص ۳۰۹)

درج بالا تبصرہ کا اقتباس عبدالماجد دریابادی کے تنقیدی مطمح نظر پر روشنی ڈالتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کو پر وقار اور اہم بنانے کے لیے مغربی ادیبوں کے اقوال کا سہارا لینے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔ وہ اسے افلاس دماغی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور مغربی اصطلاحات اور مغربی ادیبوں کے اقوال سے بھرپور تنقید کو صاحبانہ اور سرکاری رنگ کی تنقید قرار دیتے ہیں۔

ممتاز ادیب رشید احمد صدیقی کے ریڈیائی مضامین کے مجموعہ خنداں پر تبصرہ کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

> " نشریہ تیار کرنے میں مصنف کا قلم آزاد نہیں ہوتا۔ ریڈیو بہر حال ایک سرکاری محکمہ ہے اور محکمہ کی طرف سے طرح طرح کی قیدیں اور پابندیاں عائد ہیں۔ ظرافت کی بے تکلفی ان قیدوں کا تحمل کہاں کر سکتی ہے لیکن رشید صاحب کی معجز نگاری نے ان پابندیوں میں بھی اپنے کمال کو برقرار رکھا اور اس ضخیم مجموعہ کے ہر ہر صفحے کو زعفران زار بنائے رکھا ہے۔ بھرتی کا صفحہ تو شاید کوئی بھی نہ ملے۔ کتاب عوام اور کم استعداد سواد خوانوں کے کام کی نہیں۔ یہ عیب ہو یا

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ "رشیدیات" سے لطف اٹھانے کے لیے پڑھنے والے کو اچھا خاصا پڑھا لکھا ہونا چاہیے۔" (مقالات ماجد ص ۳۱۲، ۳۱۳)

درج بالا تبصرہ عبدالماجد دریابادی کی صاف گوئی اور بے باکی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ جہاں رشید صاحب کے فن کو سراہتے ہیں وہیں ساتھ ساتھ رشیدیات کے مطالعہ کے لیے گہرے علمی وادبی شعور کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی کی حق گوئی کی ایک مثال سید سلیمان ندوی کی کتاب سیرۃ النبی پر ان کا تبصرہ ہے۔ انہوں نے ندوی کی کاوش کی داد دینے کے ساتھ ساتھ اس کے کمزور پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی۔ اقتباس ملاحظہ ہو :

"جہنم کی ابدیت وعدم ابدیت کا مسئلہ شروع سے مختلف فیہ رہا ہے۔ علماء محقق اہل سنت کا بڑا گروہ جنت کی طرح جہنم کے بھی خلود کا قائل ہے لیکن خود اہل سنت کے اندر بھی شیخ محی الدین ابن عربی جیسے زبردست اہل باطن اور ابن تیمیہ وابن قیم جیسے زبردست اہل ظاہر اس عقیدہ کے مخالف بالآخر فنائے جہنم وانقطاع عذاب کے قائل گزرے ہیں۔ مولانا سید سلیمان نے اس مرجوح شق کو اختیار فرمایا ہے اور عقلی ونقلی۔ قیاس ونص دونوں قسم کے دلائل وشواہد سے سے اس کمزور پہلو کو جس قدر محکم ومدلل بنا سکتے ہیں، بنایا ہے۔ اس بے علم و کوتاہ نظر کی فہم ناقص میں کتاب کا ضعیف ترین حصہ یہی ہے۔" (سچ، ۱۴ اپریل ۱۹۳۳ء)

عبدالماجد دریابادی کی تبصرہ نگاری کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر وادب کا صالح تصور رکھتے ہیں۔ ادب کے لیے شرافت ضروری قرار دیتے ہیں۔ فصاحت وبلاغت، ضلع اور رعایت لفظی کے قتیل ہیں۔ ایجاز وشگفتگی اور سلاست کے قائل ہیں اور مشرقیت پر شدت سے یقین رکھتے ہیں۔ وہ تبصرہ نگاری میں نہایت متوازن اور مصنفانہ رویہ اپناتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اپنے عزیز ترین دوست سید سلیمان ندوی کی کتاب کے کمزور پہلو کی طرف توجہ مندول کراتے ہوئے نہیں ہچکچاتے وہیں سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند کی کتاب ذکر حافظ کے بعض پہلوؤں کو انہوں نے فراخ دلی سے سراہا۔ ان کے تبصروں میں وسیع مطالعے، ذہانت، ذوق سلیم، قدرت بیان اور صحیح ادبی مزاج کی آمیزش سے ادبی بصیرت کی جلوہ آرائی نظر آتی ہے۔ ان کی تبصرہ نگاری ادب کے اخلاقی پہلوؤں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ تخلیق کے ادبی، جمالیات حسن پر بھرپور نگاہ ڈالتی ہے۔ اردو ادب میں ان کے تبصرے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

بحیثیت سوانح نگار اور مرقع نگار

عبدالماجد دریابادی نے سوانح کے موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور اس شعبہ میں اردو میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ان کو سوانح نگاری کے اصول ضوابط سے بخوبی واقفیت تھی اور انہوں نے مشرق و مغرب دونوں کی روایات سوانح نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں جدت اور جودت کا مظاہرہ کیا۔ سوانح حیات کے سلسلہ میں ان کی دو کتابیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات۔ یہ مولانا اشرف علی تھانوی کے حالات و کمالات پر مشتمل ہے۔

(۲) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق۔ اس میں مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کے اہم حالات اور کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حکیم الامت ۔نقوش وتاثرات: اس کتاب کی بنیاد عبدالماجد دریابادی نے خطوط پر رکھی ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز علماء میں تھا اور وہ اپنے تجدیدی کارناموں کے باعث حکیم الامت کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان سے عبدالماجد دریابادی کے تقریباً ۱۵،۱۶ برس تک نہایت گہرے اور نیازمندانہ تعلقات رہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات اور نجی مراسلت و مکاتیب کے ذریعہ سے ان کی شخصیت کو زندہ جاوید بنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے کتاب کے دیباچے میں کتاب کا سبب تصنیف جس انداز میں تحریر کیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ کتاب کے مواد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ خود عبدالماجد دریابادی کے انداز سوانح نگاری اور اس کے مقاصد پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "حکیم الامت امام اشرف علی تھانوی بزرگ کس مرتبہ اور ولی کس پائے کے تھے۔ اس کا حال تو وہی بتا سکتا ہے جو خود بھی بزرگ، عارف اور ولی اللہ ہو اپنے کو تو اس کوچہ کی ہوا بھی نہیں لگی اس لیے اگر کسی صاحب نے اس کتاب کو اس ارادہ سے کھولا ہے کہ اس میں حضرت کے مرتبہ معرفت و ولائت کی تفصیل درج ہوگی یا ان صفحات میں حضرت کے مناقب عرفانی و مدارج روحانی کا بیان ہوگا تو خیر اسی میں ہے کہ آگے وہ ورق گردانی کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائیں اور کتاب کو بے پڑھے بند کی بند رہنے دیں۔۔۔ یہ مجموعہ اوراق نہ کتاب المناقب ہے نہ ملفوظات مرشد، یا سیرت الشیخ۔ اس کا موضوع ان سب سے الگ ہی نہیں سب سے پست بھی ہے۔

حضرت شیخ کے کمالات و فضائل جو کچھ بھی ہوں بہر حال اشرف علی تھانوی نامے ایک انسان بھی تو اس صدی میں ہوئے ہیں۔ ان کی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانہ میں اس "نامہ سیاہ" کو ان سے نیاز اور گہرا نیاز حاصل رہا اور اس نے اپنے لمبے تجربے اور سابقہ میں انہیں ایک بہترین انسان پایا۔ ان کی اس انسانی زندگی کا ہلکا سا عکس ان نقوش و تاثرات کے اندر بند کر دینے کی کوشش الٹی سیدھی آپ کو یہاں ملے گی اور چونکہ ان کی انسانیت۔ ان کے مفسر اور فقیہ اور درویش ہونے سے الگ کی بھی نہیں جا سکتی اس لیے ضمناً ذکر ان کے علم و فضل، تفقہ، سلوک کا لانا بھی ناگزیر ہو گیا"

اوپر دیے گئے اقتباس میں عبدالماجد دریابادی نے اپنے مقصد کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے ان کے اصول سوانح نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے پوری کتاب میں انہی مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے۔

عبدالماجد دریابادی نے مولانا تھانوی کی زندگی کے حالات اور معمولات کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ ان کے انداز بیان نے اس کو دلآویز بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی پہلی باقاعدہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یہ نشست حضرت کی خاص سہ دری میں ہوئی۔ درمیان میں مشرقی مغربی دیوار سے متصل ڈیک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما، ہاتھ میں تسبیح۔ ایک چھوٹی گھڑی سامنے۔ ڈیک پر قلمدان وغیرہ کے ساتھ رکھی ہوئی دوسری بڑی گھڑی، دھوپ گھڑی کے حساب والی دیوار میں لگی ہوئی۔ داخلہ والے در پر حضرت کا نظام عامہ اوقات لگا ہوا غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا، بائیں طرف مولانا بٹھائے گئے اور اس کے بعد ہم لوگ۔ بیٹھنے بٹھانے کے آداب، قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب و ڈھنگ۔ ہر بات میں نظم و آہنگ۔ یہ تو مجلس خاص اور "خصوصی" تھی۔ بعد میں یعنی بعد ظہر "مجلس عام" میں بھی قاعدہ یہ تھا کہ حضرت کے داہنے ہاتھ پر سہ دری میں جو جگہ پڑی ہوئی تھی وہ عام طالبین وارد ین کے لیے تھی۔ ہر شخص جہاں جگہ پائے بیٹھ جائے۔ کسی دوسرے کو نہ اٹھائے، نہ کھسکائے، بائیں طرف جگہ نسبتاً تنگ تھی کوئی سات آٹھ شخصوں کے بیٹھنے بھر کی، ادھر مخصوص بٹھائے جاتے، دو چار شخص سامنے بھی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک ایک در کی دیوار کی آڑ میں بغیر دوسرے کے حق کے حجاب بنے۔

ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ

مصرعہ سنا ہوا بڑا مرتبہ کا تھا۔ شنیدہ اور ''دیدہ'' کے درمیان فرق کا درجہ اب بالکل واضح ہوا۔ رعب وہیبت کی کیفیات میں اب خاصا فرق آگیا تھا اور حاضری کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ مولانا محض نور کے بنے ہوئے اور تقدس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے فرشتے نہیں، آب و گل سے ترتیب پائے ہوئے انسانی دل، بشری جذبات رکھنے انسان ہیں۔''

حکیم الامت کا انداز ایک داستان کا سا نظر آتا ہے کہ جس میں بات سے اور قصہ سے قصہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں عبدالماجد دریابادی نے مولانا تھانوی کے حالات سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر جہاں مناسب سمجھا بیان کر دیئے ہیں۔ کتاب کا بیشتر حصہ ان کی باہمی خط و کتابت پر مشتمل ہے جو دونوں کے درمیان ہوتی رہی ان کو مرتب نے اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ وہ سوانح عمری کا ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو سوانح نگاری کا ایک انوکھا طرز کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب شروع سے آخر تک اسی نرالے انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ عام سوانح نگاروں کی طرح کتاب کو نہ تو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور نہ ہی مضامین کی ترتیب کا کوئی نظام ہے۔ اردو میں سوانح نگاری پر یقیناً یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے جس کو ایک صاحب طرز انشاپرداز نے اپنے مخصوص انداز میں مرتب کیا ہے۔

محمد علی۔ ذاتی ڈائری کے چند ورق : عبدالماجد دریابادی کو جس طرح مولانا اشرف علی تھانوی سے گہری عقیدت تھی اسی طرح ان کو مولانا محمد علی سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کو پہلی بار ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی سے ملنے کا موقع ملا۔ اس کے کچھ دنوں بعد خط و کتابت شروع ہوئی اور تعلقات بڑھتے رہے جس کا سلسلہ محمد علی کی وفات تک رہا۔ ان کی رفاقت میں کام بھی کیا اور انہیں بہت قریب سے اس عظیم رہنما کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے انھوں نے محمد علی کے حالات اور کارناموں کو اپنی یادداشتوں کی مدد سے مرتب کیا۔ اگر حکیم الامت کی بنیاد خطوط پر رکھی ہے تو محمد علی کی سوانح کی بنیاد ڈائری پر رکھی ہے۔ اگرچہ اس کی ترتیب سوانح نگاری کے مروجہ اصولوں پر نہیں کی گئی ہے لیکن عبدالماجد دریابادی نے اس کی ترتیب میں سوانح نگاری کے بعض اہم اصولوں کو برتا ہے اور یہ کتاب ان بنیادی مقاصد کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ جو سوانح نگاری کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ کتاب اصطلاحی معنوں میں ایک باضابطہ سوانح عمری نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اس میں نہ تو محمد علی کا حسب نسب ہے اور نہ خاندانی حالات۔ نہ ابتدائی تعلیم و تربیت لیکن اس میں محمد علی کی شخصیت ان کی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے اور حقیقت میں سوانح عمری کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ صاحب سوانح کی زندگی کے اصل خد و خال سامنے آئیں۔

محمد علی سے اپنی پہلی ملاقات کو عبدالماجد دریابادی نے جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے ان کی سوانح نگاری کے فن میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد علی لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور راجہ محمود آباد کی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ان کی قلمی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"علی محمد خاں وسیع ڈرائنگ روم کے صدر میں تشریف فرما، سامنے ایک بڑی میز، دور دور کرسیوں کی قطار۔ میز کی ایک سمت میں ایک جوان رعنا۔ تندرست و تنومند کوئی ۳۳۔۳۴ سال کی عمر۔ اعلیٰ درجہ کے انگریزی سوٹ میں ملبوس بیٹھا ہوا، داڑھی تازی منڈی ہوئی، مونچھیں ذرا گھنی اور نوکیلی، ذہانت بشرہ سے جھلکتی ہوئی، شوخی و ذکاوت چہرہ سے برستی ہوئی، ممبروں میں ایک سے ایک قابل و فاضل، اس کے بڑے اور مخدوم بھی لیکن نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی ہیں اور کان اسی کی آواز پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ بولا تو سب سننے لگے وہ، وہ اٹھا تو کوئی ہنسا اور کوئی بگڑا مگر متوجہ سبھی ہو گئے۔ یہ تھا کامریڈ کا شہرہ آفاق ایڈیٹر محمد علی رام پور کا باشندہ اور علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ۔ جس کی جادو نگاری اور انگریزی انشاپردازی کا سکہ، اس وقت بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ حالانکہ کامریڈ کو نکلے ہوئے ابھی سال ہی ڈیڑھ سال ہوا تھا اور اردو روزنامہ ہمدرد کا ابھی وجود و بھی نہ تھا۔"

کامیاب سوانح نگار وہی ہوتا ہے جس کو اپنے ہیرو کے ساتھ دلچسپی بھی ہو، ہمدردی بھی ہو، اس کی نفسیات کو بخوبی سمجھتا ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب لکھنے والے کو ہیرو کی قربت و رفاقت حاصل ہو اور اس کے حرکات و سکنات کا اس نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو۔ عبدالماجد دریابادی کو برسوں محمد علی کی رفاقت حاصل رہی اور وہ ان کے رفیق کار بھی رہے محمد علی ذاتی ڈائری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورے طور سے محمد علی کی نجی زندگی سے واقف تھے اور انھوں نے کتاب میں موقع بہ موقع ہر قسم کے حالات کو ضمناً پیش کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے ان کی گھریلو زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو :

"محمد علی کی مہمان داری بھی قابل دید تھی۔ میں جب کبھی مہمان ہوتا تو خاطر داریوں کو حد اسراف تک پہنچا دیتے۔ کھانے ضرورت سے بھی زائد ہوتے، میری حیثیت سے بھی زائد اور ان کی جیب کی گنجائش سے بھی زائد۔ حق گوئی و حق نگاری میں تو یوں بھی محمد علی اپنی نظیر آپ تھے ہی۔ مہمان نواز اور سیر چشم بھی اس درجہ کے کم دیکھنے میں آئے ہیں۔ کھانا اکیلے میں کھانا جانتے ہی نہ تھے۔ پھر کھانا بھی "نان جویں" اور "نمک طعام" نہیں دستر خوان اچھا خاصا چھوٹے موٹے رئیس کا معلوم ہوتا تھا۔ اچھے سے اچھا سالن، قورمہ، قیمہ، کباب کی متعدد

پلیٹیں۔ طرح طرح لذیذ پر تکلف نمکین اور میٹھے کھانے کبھی مرغ کبھی مچھلی، خشک میوے تازے پھل خود کھاتے اور دوسروں کو زبردستی کر کے کھلاتے۔"

عبدالماجد دریابادی کی یہ کتاب مسلسل اور مکمل سوانح عمری نہیں ہے لیکن انھوں نے اپنی یادداشتوں کو اس خوبی سے مرتب کیا ہے کہ اس کتاب کے اندر محمد علی کی ساری زندگی کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ کتاب میں بیشتر حالات اور واقعات سیاسی اور نیم مذہبی نوعیت کے ہیں جس کا تعلق محمد علی کی زندگی سے ہے۔ اسی میں ہندستان کی سیاست اور لیڈروں کے حالات بھی ضمناً آگئے ہیں۔ عبدالماجد دریابادی کے مخصوص و منفرد انداز تحریر نے حالات اور واقعات کے بیان میں جان ڈال دی ہے اور حد درجہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت ناک اور سبق آموز بھی ہے۔ اس کتاب میں ان کے اسلوب خاص کی دلکشی اپنے عروج پر ہے اور انھوں نے کچھ ایسے انداز سے لکھا ہے کہ پڑھنے والا چاہے محمد علی کا عقیدت مند ہو یا نہ ہو وہ اس کتاب کو پڑھ کر بلاارادہ جھوم اٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اس کا کلام سن سن کر ڈرائنگ روم کے کوچ اور صوفے کھل کھلا کر ہنسے، اس کا پیام سن کر مسجد کے محراب و ممبر بلبلا کر رو دئے، خانقاہیں، مدرسے، پارک اور نشاط خانے، کھنڈر، ویرانے، "قوم پروروں" کی کانگریس اور "ملت پروروں" کی کانفرنس، پریس اور پلیٹ فارم، دیوبند اور ندوہ، فرنگی محل اور علی گڑھ، جمعیت علماء اور مسلم لیگ سب کے سب اس سے مانوس اور مالوف، سب کے چپے چپے پر اس کے نقش قدم کے نشان، سب کا ذرہ ذرہ اس کے خیر مقدم سے لطف اندوز، معاصر اور حریف، بہت سے تھے، یہ قبول خدا اور مرجعیت نام کی دولت سے وہی ایک ممتاز۔ یہ زور سعادت بازو کا نہیں۔ ذالک فضل الله يعطيه من يشاء"

ایک اور اقتباس جب محمد علی کو تحریک خلافت ترک موالات کے سلسلہ میں دو سال قید سخت کا حکم سنایا گیا تھا کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"نومبر میں حکم سنایا گیا دو برس کی سزا سب ملزموں کے ساتھ محمد علی کو بھی۔ محمد علی بہت گھوم پھر چکے تھے مارے مارے پھرتے بہت دن ہو چکے تھے، اب مشیت تکوینی کے حاکم کا حکم نافذ ہوا کہ مدت دراز کے لیے ایک جگہ جم کر بیٹھیں۔ انہی کی زبان میں —

دیکھیے کہ اب یہ گردش تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

اللہ اللہ کیا سماں تھا آکسفورڈ کا گریجویٹ، آنرز پایا ہوا گریجویٹ، کامریڈ کا ایڈیٹر، ملک کا ایک معروف ترین لیڈر چوروں، نقب زنوں، ڈاکوؤں اور خونیوں کے ساتھ قفس میں بند اور جس

کے ملنے والوں میں ابھی کل تک گورنر اور لفٹیننٹ گورنر، راجے اور مہاراجے، ایگزیکٹیو کونسلر اور خود وائسرائے بہادر تھے آج اس کی عزت جیل کے اندر پہرے داروں اور برق اندازوں کے رحم و کرم پر تھی۔ کوچ اور صوفے اور گدے اور قالین کی جگہ زمین کا کھرا فرش اور غذا وہ مل رہی ہے جو کبھی اس کے چاکروں اور خدمت گاروں نے بھی کیوں کھائی ہوگی۔"

اس کتاب کی نوعیت بھی حکیم الامت سے ملتی جلتی ہے اور اس کو جدید سوانح نگاری کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے مخصوص انداز تحریر، پرکشش اسلوب اور زور قلم کا یہ شاہکار اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

عبدالماجد دریابادی کا تعلق شبلی اسکول سے ہے لیکن جہاں تک سوانح نگاری کا تعلق ہے اس میں عبدالماجد دریابادی نے بلاشبہ شبلی سے الگ راہ نکالی ہے۔ دبستان شبلی کے سوانح نگار بنیادی طور پر مؤرخ نظر آتے ہیں جب کہ عبدالماجد دریابادی نے مولانا تھانوی اور محمد علی کے سوانح ان کے خطوط اور اپنی ذاتی یاد داشتوں کی مدد سے لکھے ہیں اور انہیں ایک ایسے اسلوب کی چاشنی دی ہے جس سے صاحبانِ سوانح کی شخصیت سے ایک خاص طرح کی دلی وابستگی پیدا ہوتی ہے اور ذہن ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ انھوں نے خطوط کے ذریعہ سوانح مرتب کر کے اردو میں ایک نئے طرز کی سوانح کی بنیاد ڈالی ہے۔ انھوں نے مولانا تھانوی اور محمد علی کے سوانح حیات شخصی مشاہدے اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر لکھے ہیں اور جس مؤثر و دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے وہ سیرت نگاری کے شاہکار کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ حضرات ہمارے سامنے چل پھر رہے ہوں۔ حکیم الامت اور محمد علی ذاتی ڈائری اردو زبان کے سوانحی ادب میں گراں قدر اضافے کہے جاسکتے ہیں۔

عبدالماجد دریابادی ایک بے مثال مرقع نگار بھی تھے۔ وہ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھما دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی سیر ان کے قلم سے ملاحظہ ہو:

> "وہ دیکھیے نواب محسن الملک فصاحت کے دریا بہا رہے ہیں۔ اور اب دیکھیے، شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی خطابت کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ وہ دیکھیے قاری سلیمان شاہ پھلواری آئے، اور آپ جب چاہیں گے رلا دیں گے۔ پردہ اور ہٹا۔ اب اسٹیج پر علی امام کا قبضہ ہے۔ اور اب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اپنی تقریر سے دل دہلائے دے رہے ہیں۔ ادھر شوکت علی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گرج رہے ہیں۔ ادھر محمد علی دلوں کو گرما رہے ہیں۔ مولانا شبلی کا فاضلانہ تاریخی خطبہ ابھی ختم ہوا ہے اور اب حالی کی زار نالی ہے۔ دلوں کے پتھر موم کی طرح

پہنچیں گے۔ صدر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چوٹی ہی کا منتخب ہوتا۔ سر آغا خاں، جسٹس سید امیر علی۔ نواب صاحب ڈھاکہ راجہ صاحب محمود آباد، سید حسین عمادالملک بلگرامی۔ جسٹس بدرالدین طیب جی سب اپنے اپنے جلوے دکھا کر رخصت ہو گئے۔ ایک ایک صدر کے خطبہ صدارت کو سننے کو لوگ ایک دوسرے پر پلے پڑتے۔" (صدق جدید، ۱۳ جولائی ۱۹۶۱ء)

منظر کشی میں عبدالماجد دریابادی کا قلم فوٹو کیمرے کے مترادف ہے۔ جس چیز کا بیان کرتے ہیں اسی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رقصاں ہو جاتا ہے۔ انسان کی بے بسی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مدھیہ پردیش اسمبلی میں کاروائی کے دوران معزز ممبروں پر شہد کی مکھیوں کے حملے کے بارے میں لکھتے ہیں :

(چائے کے لیے) "آگ جلی تو دھواں پیدا ہوا اور دھواں چھتے تک جا پہنچا، مکھیاں بھڑ کیں اور بگڑیں اور غضب ناک ہو کر حملہ آور ہو گئیں۔ ان کا حملہ معاذاللہ! گولی اور گولے سے بھی بڑھ کر بے پناہ! ابھی چپراسی کو کاٹا، ابھی دربان کو بھنبھوڑا۔ یہ آئیں، وہ آئیں، اور لیجیے اب حملہ خود وزارت مآبوں پر شروع ہو گیا۔ نہ چوکیداروں کی لاٹھیاں کام آئیں۔ نہ کانسٹبلوں کے ڈنڈے۔ نہ منصب و مرتبہ کا رعب بن سکا۔ وزیر با تدبیر اعزاز دو تار کا خیال کئے بغیر بے تحاشہ بھاگے۔ کسی نے کمبل کے اندر گھس کر جان بچائی۔ کسی نے غسل خانہ کے اندر اپنے کو بند کر لیا۔ جب کہیں مصیبتوں سے جان بچی۔" (صدق جدید، ۱۲ جون ۱۹۶۱ء)

یادرفتگاں کے سلسلہ میں عبدالماجد دریابادی نے لوگوں کے جو خاکے کھینچے ہیں ان کو اگر مرقع کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان خاکوں کی نمایاں خصوصیت ان کا اختصار ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مولوی مسعود علی ندوی مرحوم۔ شہرت نے لڑکپن ہی سے قدم لینے شروع کر دئے تھے۔ آج طلباء کی اس ٹولی کے سردار، کل اسٹرائک کے علمبردار۔ مولانا شبلی پر اپنے حسن خدمات سے سکہ بٹھا دیا تھا۔ استاد کی وفات کے وقت جب علمی جانشینی کی دستار فضیلت سید سلیمان کے سر بندھی تو دارالمصنفین کے پریس اور سارے کاروبار کی منیجری کا خلعت انھیں کے جسم پر راس آیا اور مدتوں اسے خوب ہی انھوں نے نباہا۔ ٹینس کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے، شکار کے شوقین اور روز دھوپ کئے ہر کام میں منجھے ہوئے تھے۔ سانپ کو دوڑ کر مارتے تھے۔ خوش انتظامی، خوش دماغی، اور جفاکشی کے پتلے تھے اور زندہ دلی، شگفتہ مزاجی کے بادشاہ۔ روتوں کو جب چاہا ہنسا دیا۔ روٹھوں کو جب چاہا منا لیا۔ نام مسعود کی مناسبت سے پورا نام "سالار مسعود غازی" ہم نیازمندوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔"

(صدق جدید، ۸ ستمبر ۱۹۶۱ء)

عبدالماجد دریابادی نے مختلف لوگوں کی شکل وصورت اس انداز سے بیان کی ہے کہ ان کا صحیح نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے گوشت پوست کے انسان سامنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تصدق احمد شیروانی کی شکل وشباہت یوں بیان کرتے ہیں :

"علی گڑھ کے کھلینڈرے ایک سے بڑھ کر ایک لیکن تماشائیوں کی نظریں بس علی گڑھ کے گول کیپر پر جمی ہوئی۔ ایک سرخ وسفید، قوی وتنومند خوشرو نوجوان۔ پہاڑ کی طرح اٹل، اور چٹان کی طرح مضبوط۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گول کیپری کے ہی کے فرائض کے لیے خلق ہوا ہے۔ لکھنو کی ٹیم بے طرح جوش اور ولولہ کے ساتھ بپھر بپھر کر کیسے کیسے حملے کرتی اور ہر حملہ اسی گول کیپر کے تصدق میں ناکام۔ بس یوں سمجھیے کہ سمندر کی غضبناک موجیں اپنی سطح سے اچھل اچھل کر حملہ آور ہوتیں اور پتھر کی چٹان سے ٹکرا کر پھر واپس چلی جاتیں۔ یہ تھا علی گڑھ کالج کا ہونہار نوجوان اور شیروانی خاندان کا چشم وچراغ تصدق۔"

(انشائے ماجد، ص ۳۔۴)

عبدالماجد دریابادی نے اسی طرح کی مرقع نگاری اپنے ہم نام مولانا عبدالماجد بدایونی کے سلسلہ میں بھی پیش کی ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ ہو :

"تقریر اور مؤثر تقریر ہر موضوع پر کر سکتے تھے سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر بھی دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو لٹا دیتے تھے لیکن اصلی ذوق اور فطری شوق کی چیز محفل میلاد تھی۔ حبیب رب العالمین کا ذکر کرنے کو اٹھتے تو آپے میں نہ رہتے۔ کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے۔ خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتیں اور خوش بیانی مست مست ہو ہو کر منہ چومتی۔" (وفیات ماجدی، ص ٦٦)

اس عبارت میں "بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے۔" فقرے بصری پیکریت کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ انھوں نے بدایونی کی گفتار کو بلبل سے اور ان کی حرکات کو شاخ گل سے تشبیہ دے کر مرقع نگاری کو مکمل کر دیا ہے آخر میں عبدالماجد دریابادی کے قلم سے مولانا مناظر احسن گیلانی کا تعارف ملاحظہ ہو :

"مولانا شیروانی کے دولت کدے پر کوئی کمیٹی تھی۔ نظر ایک نئے چہرہ پر پڑی اور جی چاہا کہ اب پڑی ہے تو پڑی رہے، ہٹنے نہ پائے۔ نرم اور روشن چہرہ پر ریشم کی طرح نرم اور ملائم ڈاڑھی۔ دل نے کہا اس چہرہ کو دیکھتے ہی چلے جائیے۔ بتانے والے نے بتایا کہ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی ہیں۔ اللہ اللہ کیسا دھوکا ہوا۔ نام سے عرصہ سے واقف تھا، ایک خیالی صورت بھی ذہن

میں تھی لیکن صورت، سیرت ہر چیز سے متعلق خیال اور انداز کتنا مختلف نکلا۔ خیال تھا کہ مسن ہوں گے یہ نوجوان نکلے۔ خیال تھا بڑے "سجات" بڑے مناظر ہوں گے اور خشکی و کرختگی کے پتلے۔ مشاہدہ نے بتلایا کہ ایک لطیف جسم۔ لطیف تر روح کو چھپائے ہوئے، خندہ رو، نرم خو، نہ کرختگی، نہ ثقالت۔ برعکس اس کے ایک پیکر لطافت قال کے موقع پر قال اور حال کے موقع پر حال، صورت پر نورانیت برستی ہوئی۔ گفتگو سے محبوبیت ٹپکتی ہوئی۔

(وفیات ماجدی، ص ۲۶)

درج بالا اقتباس کا ایک ایک لفظ روح میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے اور پوری عبارت پڑھ کر شخصیت میں جان پڑ جاتی ہے۔ یہ طرز ادا کا باعث ایسا ہے جس کا لطف بس دل ہی دل میں لیا جاسکتا ہے۔

اس طرح کے اقتباسات تو بے شمار پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن ان چند مثالوں سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عبدالماجد دریابادی کو مرقع نگاری میں کمال حاصل تھا۔ انھوں نے شخصیت نگاری میں صداقت اور حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ یہاں تک کہ ایسے معاصرین کے بارہ میں بھی انصاف پسندی سے کام لیا ہے جن سے انھیں شدید اختلافات رہے مثلاً مولانا مودودی اور نیاز فتح پوری۔ انھوں نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا اس کے کردار و میلان کی تصویر کھینچ کر رکھ دی اور اپنے خاکوں میں انھوں نے سراپا نگاری اور کردار نگاری کی مہارت دکھائی ہے۔

بحیثیت محقق و مرتب

عبدالماجد دریابادی نے تحقیق و ترتیب کے شعبہ میں بھی اپنی ہمہ گیر شخصیت کے نقوش چھوڑے ہیں۔ علم و ادب سے گہرا شغف رکھنے کے نتیجہ میں انھوں نے چند مخطوطات اور خطوط کو ایڈٹ کیا اور کئی اہم کتابوں کا ادبی دنیا سے پہلی بار تعارف کرایا۔

تحقیق کے میدان میں عبدالماجد دریابادی کا سب سے پہلا کارنامہ مولانا روم کے ملفوظات "فیہ مافیہ" کو ایڈٹ کرنا ہے انھیں ۱۹۲۰ء میں رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں اس کا نسخہ مل گیا۔ اس کے بعد حیدرآباد میں ان کو دو نسخے مزید مل گئے۔ ایک تو نواب سالار جنگ کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ سے۔ گویا جس کتاب کا ایک ہی نسخہ ناپید سمجھا جاتا تھا اس کے جب تین تین نسخے اکٹھا ہو گئے تو انہیں اس کی اشاعت کا خیال آیا۔ اسی دوران ان کی کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن سے خط کتابت ہوئی اور ان کے توسط سے ان کو ایک اور نسخہ قسطنطنیہ سے بھی موصول ہو گیا جو ہندوستان کے تینوں

نسخوں سے زیادہ مکمل اور جامع تھا۔ انھوں نے اپنے نسخہ کی تدوین اور تصحیح میں بڑی کاوش کی۔ قرآن، حدیث کی مستعملہ عبارتوں کی تصحیح میں بھی محنت کی یہ محنت انھوں نے مغرب کے اہل قلم کے لیے نہیں بلکہ مشرق کے اہل ذوق کی خدمات کے لیے کی اس اعتراف کے ساتھ کہ :

"اس کتاب میں متعدد فقرے ایسے ہیں جن کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا ہوں۔ اکثر ایسے موقع پر نشان استفہام (؟) بنادیا۔ ممکن ہے کوئی دوسرے صاحب مطلب نکالیں۔ میں نے اسی طرح نقل کر دیا ہے جس طرح پایا تھا۔" (دیباچہ فیہ ما فیہ)

انھوں نے دیباچہ میں فیہ ما فیہ کے سلسلہ میں نہ صرف بنیادی معلومات فراہم کیں بلکہ تذکرہ مولانا جلال الدین رومی کے تحت ان کے مستند حالات زندگی اور تبصرہ فیہ ما فیہ کے عنوان سے اس رسالہ کے شمولات کا تعارف بھی کرایا ہے۔

تحقیق کے ضمن میں ایک دوسری اہم کتاب جس کو عبدالماجد دریابادی نے ادبی دنیا سے پہلی بار متعارف کرایا وہ مثنوی بحرالحب ہے مصحفی کی یہ تصنیف ان کو اپنے عزیز حکیم عبدالحسیب دریابادی کے کتب خانہ سے مخطوطہ کی صورت میں ملی تھی۔ اس مخطوطہ کے طبع اول کے نکلنے کے بعد انہیں ایک دوسرا قلمی نسخہ بھی مل گیا جو ان تک سید محفوظ علی بدایونی کی وساطت سے پہونچا تھا۔ یہ پہلے قلمی نسخہ سے سولہ سال پہلے کا تھا۔ عبدالماجد دریابادی نے نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ دونوں نسخوں کا تقابل کر کے متن کا کام بخوبی انجام دیا۔ اس کے دیباچہ میں تحقیق کے مسلمہ اصولوں کے مطابق پہلے اور دوسرے قلمی نسخوں کی مطلوبہ تفصیل سے قارئین کو آگاہ کیا۔ انھوں نے صرف دیباچہ نگاری ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ مصحفی کے مفصل حالات بھی مرتب کئے۔

جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے اس میں تحفہ خسروی، خطوط مشاہیر اور مکتوبات سلیمانی قابل ذکر ہیں۔

تحفہ خسروی عدل و آداب جہانبانی پر ایک مجموعہ منتخبات ہے جس میں قرآن، حدیث، پند نامہ عطار، اخلاق جلالی، صحبۃ الابرار، گلستاں بوستاں، اخلاق محسنی، مثنوی معنوی، شاہنامہ، بہارستان، کیمیائے سعادت اور سیاست نامہ وغیرہ سے اقتباسات لیکر ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جن کتابوں سے اقتباسات لے کر تحفہ خسروی مرتب کی گئی وہ دنیائے ادب و فکر میں سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس میں شامل حکیمانہ نکات، دلپذیر نصائح اور دلکش اسلوب بیان پر مبنی ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان عادل کا ایک دن عدل ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے۔ اس تالیف میں حاکم و محکوم کی حیثیت پر قرآن و حدیث اور اقوال حکماء کی روشنی میں بحث کی گئی اور اس کا پس منظر تحریک خلافت یا تحریک ترک موالات تھی جس سے عبدالماجد دریابادی

وابستہ تھے۔

عبدالماجد دریابادی کی دوسری مرتب کردہ کتاب خطوط مشاہیر ہے۔ اس میں تین مشاہیر ادب کے خطوط ہیں یعنی شبلی، اکبرالہ آبادی اور مولانا محمد علی۔ ان سب سے عبدالماجد دریابادی کے گہرے علمی، فکری، جذباتی اور ذہنی روابط تھے۔ ان خطوط پر دیباچہ لکھنے کے علاوہ ان تینوں مشاہیر کے خطوط کے اندراج سے قبل الگ سے ایک ایک اور دیباچہ بھی لکھا ہے جن میں مکتوب نگار کی شخصیت اور مکتوب الیہ (مرتب) کے سلسلہ میں ضروری پس منظر فراہم کیا گیا ہے یہ خطوط اہم بھی ہیں اور مفید بھی۔ ان کے مطالعہ سے عبدالماجد دریابادی کی سیرت اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور ان مشاہیر ادب کے ساتھ ان کے تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی کے درمیان نہایت گہرے دوستانہ تعلقات رہے۔ سید صاحب سے عبدالماجد دریابادی کے تعلقات کی ابتدا اس زمانہ سے ہوئی جب سید سلیمان ندوی استاد کی حیثیت سے دارالعلوم ندوۃ العلوم لکھنؤ سے وابستہ تھے اور عبدالماجد دریابادی کینگ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۱۲ء کے بعد مختلف جلسوں اور کانفرنسوں کے علاوہ دونوں کو کبھی ایک مرکز پر جمع ہونے اور ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن خطوط کے ذریعہ علمی مسائل میں تبادلہ خیالات اور نجی معاملات میں صلاح و مشورہ برابر جاری رہا۔ عبدالماجد دریابادی کی مرتب کردہ مکتوبات سلیمانی" کی دو جلدیں اسی ربط باہمی کی یادگار ہیں۔ عبدالماجد دریابادی نے سید سلیمان ندوی کے لکھے ہوئے ۴۰۱ خطوط کو بڑے سلیقہ اور تقریباً تیرہ سو حواشی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ مکتوبات سلیمانی کا پہلا خط اکتوبر ۱۹۱۲ء کا ہے اور آخری خط جولائی ۱۹۵۳ء ہے۔ ان خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی مدد سے تقریباً نصف صدی کی اس مدت کے اہم واقعات اور حالات و کوائف کا احاطہ کر کے عبدالماجد دریابادی کی مستند سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔

عبدالماجد دریابادی نے تحقیق و ترتیب کے شعبہ میں اگرچہ زیادہ کام نہیں کیا لیکن جتنا بھی کیا وہ اپنی جگہ اہم اور ناقابل فراموش ہے۔ ملفوظات رومی یعنی فیہ مافیہ کے متن کو درست پڑھنا اور ان کی تصحیح کرنا ایک نہایت دشوار کام تھا۔ ہندوستان میں یہ کام عبدالماجد دریابادی نے ہی سب سے پہلے انجام دیا۔ اسی طرح مصحفی کی مثنوی، بحرالمحبت کو انھوں نے پہلی بار شائع کیا اور اس پر ایسا جامع و مبسوط مقدمہ لکھا جو ان کی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت ہے۔ اسی طرح "خطوط مشاہیر" اور مکتوبات سلیمانی کو مرتب کر کے انھوں نے نہایت مفید اور قابل قدر خدمت انجام دی اور اردو ادب کو فائدہ پہونچایا۔

بحیثیت عالم دین اور مفسر قرآن

عبدالماجد دریابادی کے علم و فضل کا انتہائی کمال یہ ہے کہ وہ با قاعدہ "مسٹر" سے "مولانا" بن گئے جبکہ انھوں نے نہ کسی دینی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ نہ کسی بڑے عالم سے احادیث و فقہ اور تفسیر کا درس لیا۔ عربی زبان جتنی سیکھی وہ اسکول اور کالج میں بطور ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے۔ ایسی مثالیں تو کثرت سے ملتی ہیں کہ دینی علوم کی با قاعدہ تحصیل کے بعد ایک عالم دنیوی علوم میں بھی مہارت حاصل کر لیتا ہے لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ ایک شخص جس نے ابتدا سے عالم شباب تک باضابطہ دینی تعلیم حاصل نہ کی ہو بلکہ مذہب کی مخالفت پر کمربستہ رہا ہو پھر اچانک وہ دینی علوم میں بھی اتنی مہارت حاصل کر لے کہ علماء نہ صرف اس کو صف میں جگہ دیں بلکہ وہ اس صف میں نمایاں اور ممتاز حیثیت حاصل کر لے۔

عبدالماجد دریابادی کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے جب مذہب کی طرف رخ کیا تو اپنے ذوق و شوق اور محنت و لگن سے برسوں کا سفر دنوں میں طے کر لیا مولوی صاحبان عام طور سے کسی ایسے شخص کو اپنی جماعت میں شامل نہیں کیا کرتے جس نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل نہ کی ہو لیکن عبدالماجد دریابادی ایک ایسے شخص ہیں جن کو مولوی صاحبان نے با قاعدہ عالم تسلیم کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ان کو اعزازی "ندوی" تسلیم کیا گیا اور مولانا حبیب الرحمان شیروانی نے اپنے خطبہ میں ان کو با قاعدہ فضلاء ندوہ میں شمار کر کے بطور سند کے پیش کیا تھا۔

عبدالماجد دریابادی کا تصور مذہب کسی جامع ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ ان کے تصور دین میں گریز اور رہبانیت نہیں تھی۔ انھوں نے اسلام کے نظری پہلوؤں کے ساتھ اس کی عملی تعبیرات پر بھی پوری توجہ دی۔ وہ جانتے تھے کہ حالات کس قدر بدل چکے ہیں اور ان حالات میں اسلام کی جو موزوں ترین تعبیر ہو سکتی تھی وہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ کی۔ وہ جدید علوم سے واقف اور مغربی طرز تعلیم کی پیداوار تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی طرح عبدالماجد دریابادی نے بھی مغربی علوم سے بے حد استفادہ کیا اور اسے مذہب کی حمایت میں بڑی حکمت کے ساتھ استعمال کیا۔ ایک صحافی اور ایک دانشور کی حیثیت سے وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و کوائف و ماحول سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی رہنمائی کی۔ اسلامی تعلیمات کو اس کی اصلی شکل و صورت میں نہایت مؤثر اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ مذہبی فرقوں کے تنازعات کی علانیہ مذمت کی۔ چونکہ وہ جدید علوم سے بخوبی واقف تھے اس لیے جدید علوم کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جو نئے نئے مسائل پیدا ہوئے ان کے پیش نظر قرآن کی تعلیمات کی تشریح کی۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی اور اسوۂ صحابہ کو اس ڈھنگ سے پیش کیا جس کو

جدید تعلیم کے پروردہ طبقہ نے قبول کیا۔ وہ چونکہ فلسفہ اور منطق کے عالم تھے اس لیے انھوں نے عقلی دلائل سے بھی مذہبی صداقتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور اپنی بے شمار تحریروں کے ذریعہ بڑی اہم گتھیوں کو سلجھایا۔

عبدالماجد دریابادی ان علمائے اسلام میں تھے جن کی ساری زندگی اتحاد بین المسالک کی کوشش میں گزری۔ وہ اپنے اعتدال اور توازن کی بناء پر تکفیر کے معاملہ میں نہایت محتاط تھے۔ انھوں نے کسی شخص کی تکفیر نہیں کی۔ وہ خود لکھتے ہیں :

کلمہ گو فرقوں کی تکفیر کے باب میں (ان کی ساری گمراہیوں اور زیادتیوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی) مجھے شرح صدر کبھی نہیں ہوا اور اب تک بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس بارہ میں اس عاصی کا مسلک اپنے اکابر سے بڑی حد تک اب بھی الگ ہے۔"

(صدق جدید، ۱۶ فروری ۱۹۶۸ء)

اپنے ایک اور مضمون میں عبدالماجد دریابادی نے لکھا "میں کسی بھی کلمہ گو کی تکفیر کا قائل نہیں۔" ان کا خیال تھا کہ ایک کلمہ گو کے قول کی کمزور سے کمزور تاویل بھی اسے خارج از اسلام کر دینے کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔ کسی مخصوص فرقہ کے عقیدہ کو تمام تر غلط سمجھ لینے کے بعد اس کی طرف سے حق و انصاف کی آنکھیں بالکل بند نہ ہونی چاہئیں۔ علاوہ بریں ایک اسلامی عالم ہونے کی حیثیت سے عبدالماجد دریابادی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تفسیر قرآن ہے جو انھوں نے اردو اور انگریزی دو زبانوں میں لکھی۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور زبان و ادب کے اعتبار سے اسے ایک شاہکار کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی تفسیر لکھنا آسان نہیں۔ اس کے لیے جس محنت و مشقت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ وہی اہل علم کر سکتے ہیں جنھوں نے اس فن میں مہارت حاصل کی ہے۔ خود عبدالماجد دریابادی تفسیر نگاری کا واضح تصور اور بلند معیار رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مفسر کا محض متقی و پرہیزگار ہونا اور اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان و ادب پر محض گہری نظر رکھنا ہرگز کافی نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں، رجحانات اور عقائد نظریات پر گہری نظر رکھتا ہو۔ عصر حاضر میں مفسر قرآن کی ذمہ داریاں کتنی بڑھ گئی ہیں اور اس کے لیے قدیم و جدید علوم سے واقفیت کتنی ضروری ہو گئی ہے اس کا ان کو پورا احساس تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

"لازم ہے کہ جدید مفسر و شارح تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب و نواح عرب کے شرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں خصوصاً فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا،

اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا، کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہونا بیان کرے گا اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخص نام سمجھ کر دعوائے الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا۔"

عبدالماجد دریابادی کی تفسیر قدیم انداز فکر اور جدید طرز تحقیق و تصنیف کے امتزاج کی بہترین مثال ہے۔ یہ جدید طریقہ تصنیف اور اصول تحقیق کے مطابق دور حاضر کے سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی حالات اور معاشرتی زندگی کی پیچیدگیوں اور مختلف عصری علوم و فنون اور افکار و خیالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ان تمام سوالات کا نہایت تشفی بخش جواب دیا گیا ہے جو مغربی علوم سے متاثر طبقوں کے ذہنوں میں اٹھتے ہیں۔ اس تفسیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انھوں نے اپنے پیشرو مفسرین کے تفسیری نکات اور ان کی علمی تحقیقات کو نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ اس میں انھوں نے قرآنی بیانات کی تاثیر اور توثیق کے لیے دیگر آسمانی کتابوں مثلاً توریت، انجیل کے اقتباسات نقل کئے ہیں اور زمانہ حال کے مغربی مورخین اور محققین کے بیانات بھی۔

تفسیر ماجدی یقیناً ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس تفسیر کو لکھنے کے لیے انھوں نے اردو، عربی، فارسی، انگریزی تفسیروں کا مطالعہ کیا، لغات، تاریخ، جغرافیہ، آثار قدیمہ، مخطوطات و نقشہ جات پر نظر ڈالی اور یہ تمام کام بالکل تن تنہا اپنی محنت اور دیدہ ریزی سے کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو خود بھی بڑے علم دوست اور مصنف تھے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ عبدالماجد دریابادی کے اس کارنامہ کو سراہتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ کام تو عالموں کی پوری جماعت کے کرنے کا تھا جو انھوں نے تنہا کیا۔"

نشریات ماجد

عبدالماجد دریابادی کا شمار ان چند گنے چنے علماء میں ہوتا ہے جنھوں نے ریڈیو کے ذریعہ مذہب اسلام، مشرقی تہذیب اور اردو زبان کی خدمت انجام دی۔ انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر مختلف مذہبی و ادبی عنوانات پر تقریریں کیں جو معنویت، بلاغت، روانی اور سلاست کا بہترین نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔ ان نشریات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے نشر کرنے کا ایک مخصوص انداز اپنا لیا تھا جس کا لطف سننے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے نشریات کی زبان کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ماتکیر و فون کے تقاضوں سے کس قدر باخبر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

" گفتگو جب ضبط تحریر میں آگئی تو وہ گفتگو رہی کہاں۔ بے تکلفی کا ماحول ہی جب بدل گیا تو بے تکلفی پیدا کہاں سے ہوسکتی ہے۔ کاغذ پر لے آنے کے بعد تو یقیناً وہ تحریر ہوگئی اور اس کے ڈانڈے تمام تر مقالہ یا مضمون سے مل گئے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر نشریے لکھے لکھائے مقالے معلوم ہوتے ہیں کہ پردہ کی آڑ سے کہیں پڑھ کر سنا دیے گئے اور اچھے اچھے اہل قلم یا اہل علم مائیکروفون پر جا کر بالکل بور ثابت ہوتے ہیں اور TALKER یا باتونی کی حیثیت سے صفر محض نکلتے ہیں۔ لکھنے اور بات کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور تحریر کی زبان بول چال سے بالکل الگ ہونی چاہیے۔" (دیباچہ نشریات ماجد)

عبدالماجد دریابادی کے نشریوں کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ یہ مقالے نہیں بلکہ مکالمے معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس ذریعہ ابلاغ کے ذریعہ اپنی تقاریر میں ادبا، شعرا اور سیاسی و مذہبی شخصیات کو زندہ اسلوب میں چلتے پھرتے، بولتے چالتے اور ہماہمی کرتے دکھایا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

" یہ میر صاحب تھے کہاں کے ؟ کس خاک سے اٹھے، کس خاک میں ملے ؟ آنکھ اکبر آباد کی سرزمین پر کھولی۔ یہیں پلے بڑھے، کھیلے کودے، قدم جوانی کی دہلیز پر رکھا ہی تھا کہ دلی کی کشش نے زور دکھایا۔ آئے اور جیسے یہیں کے ہو گئے۔ جوانی کی چڑھی ہوئی کمان ابھی اتری ہی تھی کہ آصف الدولہ کی قدر دانیاں پیشوائی کے لیے آگے بڑھیں اور لکھنؤ کھینچ لائیں اور سعادت علی خان کے زمانہ میں یہیں تربت کو آباد کیا۔" (نشریات ماجد ص ۳۶)

ایک دوسرا اقتباس امیر خسرو کے بارہ میں :

" خالق باری کا نام بھی آج کے لڑکوں نے نہ سنا ہوگا۔ کل کے بوڑھوں کے دل سے کوئی پوچھے ! کتاب کی کتاب از بر تھی۔ زیادہ نہیں پشت در پشت ادھر کی بات ہے کہ کتاب تھی مکتبوں میں چلی ہوئی گھروں میں پھیلی ہوئی۔ زبانوں پر چڑھی ہوئی۔ گویا اپنے زمانہ تصنیف سے صدیوں بعد تک مقبول و زندہ، مشہور و تابندہ! دست قدرت نے جس کی زبان میں یہ موہنی رکھ دی تھی، جس کے کلام کو قبول حسن کی دولت دے دی تھی۔ اس کا نام تھا امیر خسرو۔ امیروں میں امیر فقیروں میں فقیر، عارفوں کا سردار، شاعروں کا تاجدار، شعر و ادب اس کی عظمت کے گواہ، خانقاہیں اور سجادے اس کے مرتبہ سے آگاہ۔ سر مشاعرہ آ جائیے تو میر محفل اسے پائیے۔ خاندان چشت اہل بہشت کے کوچہ میں آ نکلے تو حلقہ ذکر و فکر میں سر مسند اس کا جلوہ دیکھیے۔ اچھے اچھے شیخ دم اس کا بھر رہے ہیں۔ معرفت و طریقت کے خرقہ پوش کلمہ اس کے نام کا پڑھ رہے ہیں۔" (نشریات ماجد ص ۶۱)

ایک اور اقتباس مشرقی تہذیب کے بارہ میں :

" ہاں وہی مشرق جہاں ہر صبح مسجدوں میں اذانیں ہوتی ہیں اور مندروں میں گھنٹے بجتے ہیں۔ جہاں صبح آفتاب نکلنے سے پہلے شروع ہو جاتی ہے اور جہاں شام دن چھپنے کے ساتھ ہی آجاتی ہے۔ جہاں یہ نہیں ہوتا کہ سائنس کا کمال رات کو دن بنادے اور آرٹ کی "جنت نگاہ" دن میں رات کے سارے مزے بھر دے۔ یہ وہ زمین ہے جس پر کبھی آسمان کو بھی ناز رہ چکا ہے۔ نبی ولی اور بڑے بڑے رشی گیانی کسی زمانہ میں اس زمین پر چلے پھرے، رہے بسے ہیں اور گیان دھیان کی سادھیوں کو رچائے ہوئے ہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں اب تک عزت ہو رہی ہے برقعے اور گھونگھٹ کی، نقاب کی چادر کی، جہاں اب تک شوہر کو سر تاج اور سوامی کہا جاتا ہے اور باپ کو قبلہ و کعبہ لکھا جاتا ہے۔" (نشریات ماجد ص ۱۲)

درج بالا اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نشریات میں عبدالماجد دریابادی کا اسلوب تحریر نشری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ ہلکا پھلکا، رواں سادہ اور بول چال کے انداز کا حامل۔ چونکہ ریڈیو تقریر نہیں چاہتا محض گفتگو TALK چاہتا ہے اس لیے انھوں نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر جو گفتگوئیں کی ہیں وہ اپنی دلچسپی اور تازگی کے لیے اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے کارناموں میں ان کی نشری تقاریر کا بھی شمار رہے گا۔ " منشی سجاد حسین اور طرحدار لونڈی" "اکبر الہ آبادی،" مرزا رسوا اور مراؤ جان ادا" اور اس طرح کے نہ جانے کتنے علمی و ادبی اور تہذیبی گوشے ہیں جو نشریات ماجد میں محفوظ ہیں۔ مضامین کے تنوع اور دل آویزی کی بنا پر یہ تقریریں ادب عالیہ میں جگہ پانے کی مستحق ہیں۔

قومی تحریک میں حصہ

عبدالماجد دریابادی اگرچہ سیاست کے مرد میدان نہیں تھے لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سیاست اسے یکسر لاتعلق رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی بھرپور زندگی کا ایک دور جو گو کہ مختصر تھا ایسا بھی گزرا ہے جب انھوں نے عملی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔

عبدالماجد دریابادی ایک غیر معمولی حساس انسان تھے۔ وہ ایک ایسے دانشور تھے جن کی قدیم و جدید دونوں علوم پر گہری نظر تھی۔ وہ اپنے دور کے سماجی اور سیاسی مسائل اور تحریکات سے خود کو مکمل طور پر علیحدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ چونکہ فطری طور پر ان کا مزاج سیاسی نہیں تھا اس لیے انھوں سیاست کے بارہ میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا خود کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن وقت اور حالات کے تقاضوں سے مجبور ہو کر وہ رفتہ رفتہ سیاست کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہ تبدیلی کب اور کیسے رونما ہوئی؟ اس کا جواب خود عبدالماجد دریابادی نے اپنی سوانح میں یوں دیا ہے :

"جب اپنے ہوش کی آنکھیں کھلیں تو مسلمانوں کی مسلّم پالیسی سرکار انگریزی کی تائید اور وفاداری کی پائی۔ میٹرک پاس کرتے (جون ۱۹۰۸ء) تک اپنا بھی یہی رنگ ماحول کی تقلید میں رہا۔ کالج میں آنے اور لکھنؤ میں قیام کے بعد جب "آزادی" کی ہوا لگی تو اپنے خیالات بھی بدلنے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔" (آپ بیتی، ص ۲۶۰)

ایک حساس انسان ہونے کی حیثیت سے عبدالماجد دریابادی اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نہ تو بے خبر رہ سکتے تھے اور نہ ہی مختلف واقعات اور حادثات کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں جب برطانوی حکومت نے مسز اینی بیسنٹ کو گرفتار کیا تو اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے اپنی "آپ بیتی" میں لکھا :

"۱۹۱۷ء میں جب حکومت نے مسز بیسنٹ جیسی آفاقی شخصیت رکھنے والی کو تحریک ہوم رول کے سلسلہ میں گرفتار و نظر بند کر دیا تو اس دھماکے سے سارا ملک دہل گیا اور مجھ پر بھی ایک جوش کا عالم طاری ہو گیا۔" (آپ بیتی، ص ۲۶۲)

تحریک خلافت اور ترک موالات کا جب زور بندھا اور ہر روز ہر جگہ جلسے ہونے لگے اور جلوس نکلنے لگے تو عبدالماجد دریابادی بھی ان جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے لگے۔ اس دور کی سیاسی شخصیات میں وہ سب سے زیادہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے متاثر ہوئے۔ ان کو محمد علی کے فہم و اخلاص دونوں پر مکمل اعتماد تھا۔ محمد علی سے عقیدت اور محبت کا اظہار عبدالماجد دریابادی کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مولانا محمد علی کی زندگی بھر انھیں کو اپنا سیاسی پیشوا سمجھتا رہا۔ ان کے فہم و اخلاص دونوں پر سو فیصدی اعتماد تھا۔ ان کے بعد سے کوئی لیڈر اس پایہ کا نہ ملا۔" (آپ بیتی، ص ۲۶۲)

مولانا محمد علی کے اصرار پر عبدالماجد دریابادی نے اس دور کی عظیم الشان خلافت تحریک میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گئے۔ ان کو اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ اس کے علاوہ وہ مرکزی خلافت کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔ مرکز کی ممبری بڑے اعزاز کی چیز تھی۔ تحریک خلافت کی بنیاد مسئلہ خلافت و مقامات مقدسہ کے بارہ میں ان وعدوں اور معاہدوں کے ایفاء تکمیل کا مطالبہ تھی جو پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے مسلمانانِ عالم اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں سے کئے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں برطانیہ کی فتح اور ترکی کی شکست کے بعد برطانیہ کے تیور بدل گئے اور مسلمانانِ ہند سے کئے گئے وعدوں سے مکر جانے کے قرائن و شواہد یکے بعد دیگرے نظر آنے لگے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی۔ تحریک خلافت کا یہ پہلو خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس سے ہمارے ملک میں آزادی کامل کی بنیاد پڑی اور ہند و مسلم اتحاد کا بیج بویا گیا۔ پہلی مرتبہ ہندوستان برطانیہ کی رعایا ہونے پر فخر کرنے کی ذلت سے نکلا اور ملک کے ہر باشندہ نے خود داری اور خود استادی کی فضا میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریک خلافت دراصل ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا اور اسی اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھ لیا اور پا لیا۔ جو نظارہ ہندو مسلم اتحاد کا اس تحریک کے زمانہ میں دیکھنے میں آیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔

چونکہ عبدالماجد دریابادی اودھ خلافت کمیٹی کے صدر تھے اس لئے فروری ۱۹۲۷ء میں ہونے والی آل انڈیا خلافت کمیٹی کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کا صدر بھی انہیں کو بنایا گیا۔ انھوں نے اس موقع پر جو خطبہ صدارت پڑھا اس سے ایک اجمالی نقشہ اس وقت کی سیاست اور اس وقت کے مسائل کا نظر کے

سامنے آجاتا ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالماجد دریابادی کی سیاست حاضرہ پر گہری نظر تھی۔ جہاں تک تحریک ترک موالات کا تعلق ہے وہ علمی حد تک اس کے علم بردار رہے۔ گاندھی جی سے ان کی تاثر پذیری گہری سطح پر تھی۔ آجکل میں شائع شدہ مضمون "غبار کارواں" میں وہ گاندھی جی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :

"گاندھی جی کی دور اندیشی، تدبر اور اخلاص، سب کا مداح زندگی بھر رہا۔"

الحاد سے مذہبیت کی جانب دوبارہ رجوع کرنے میں دوسری شخصیات کے علاوہ گاندھی جی بھی شامل تھے۔ گاندھی جی کے اثر سے ہی انھوں نے کھدر پہننا شروع کیا۔ انھیں گاندھی جی کی مذہبت نے متاثر کیا تھا اور اس رواداری نے بھی جس کے تحت وہ دیگر مذہبوں کا احترام کرتے تھے۔ رسالہ صبح امید میں شائع شدہ ان کا مضمون گاندھی جی سے ان کی عقیدت کا مظہر ہے۔ یہ مضمون گاندھی جی کے اصول سیاست، تصور مذہب اور نظریہ تمدن کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔

ہندستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہونچانے اور اس تحریک کے مخالفوں کے جواب میں ان کی تحریریں ناقابل فراموش ہیں۔ عدم تشدد کی افادیت ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن کو سند بنایا اور "ماڈرن ریویو" میں "اسلام اور ستیہ گرہ" کے عنوان سے مضمون لکھ کر یہ ثابت کیا کہ گاندھی جی کی ستیہ گرہ کی تعلیم اسلام کی امن پسندی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چرخے کی حمایت میں مضمون لکھا جس میں احادیث کے حوالے سے یہ بتایا گیا تھا کہ چرخہ رسول اللہ کو مرغوب تھا اور ام المومنین ام سلمہ کا یہ قول نقل کیا کہ چرخہ شیطان کو بھگاتا ہے اور رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ جس عورت کے سوت کی پیڑی زیادہ لمبی ہوگی وہی عورت زیادہ ثواب والی ہوگی۔ نمک ستیہ گرہ میں جس قانون کو توڑا جا رہا تھا اس کی خالفت میں بھی انھوں نے احادیث کا حوالہ دیا اور جب ایک سرکار پرست کے مکان پر کچھ مسلمان دو کانداروں نے جلسہ کرکے سرکار سے کہا کہ وہ ستیہ گرہیوں کو ان کی دوکانداری میں خلل ڈالنے سے روکے تو عبدالماجد دریابادی نے ان کو سرزنش کرتے ہوئے لکھا :

"اپنی اس بے غیرتی اور خود غرضی کا مطالبہ کرنے سے قبل ان حضرات نے صاف صاف اس کا اعلان کیوں نہ فرمادیا کہ ہمیں اسلام کے فرائض و حقوق، دین کے نفع و نقصان سے کیا غرض۔ ہمارا دین اور ہمارا ایمان تو نفع کے پیسے ہیں اور بس !! اس اعلان کے بعد ملت اسلامیہ تو اس ننگ کے داغ سے محفوظ رہتی۔" (سچ، ۱۲ مئی ۱۹۳۰ء)

عبدالماجد دریابادی تحریک خلافت کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست کی خارزار وادی میں داخل ہوئے اور چند برسوں تک اس میں سرگرم عمل رہے۔ خلافت کمیٹی کے علاوہ اس وقت جو دوسری بڑی سیاسی

جماعتیں مثلاً انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ میدان میں تھیں ان سے عبدالماجد دریابادی کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا لیکن اس کے باوجود ۱۹۳۲ء میں کسانوں کی تحریک کے سلسلہ میں جب پنڈت جواہر لال نہرو دورہ کرتے ہوئے دریاباد آئے تو میٹنگ کی صدارت عبدالماجد دریابادی نے کی۔

عبدالماجد دریابادی کا سیاسی دور تحریک خلافت سے شروع ہوا۔ ان کی سیاسی تربیت اور سیاست سے واقفیت میں مولانا محمد علی جوہر کا اہم حصہ رہا جس کا اعتراف عبدالماجد دریابادی نے متعدد بار اپنی تحریروں میں کیا۔ مولانا محمد علی کے انتقال کے بعد وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ اس مختصر مدت میں عبدالماجد دریابادی نے اپنی ہمہ گیر شخصیت کے جو نقوش اس شعبہ میں ثبت کئے وہ آج تاریخ کا حصہ ہیں۔ عملی سیاست سے کنارہ کشی کے باوجود وہ علمی طور پر قومی تحریک سے وابستہ رہے اور اپنے اخبار اور تحریروں کے ذریعہ اس تحریک کو تقویت پہونچاتے رہے۔

تصانیف کی موضوعاتی فہرست

عبدالماجد دریابادی کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ انھوں نے بہت چھوٹی عمر میں مضمون نگاری شروع کردی تھی۔ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بے تکان لکھتے رہے۔ ان کی تصانیف وتراجم کی مکمل موضوعاتی فہرست حسب ذیل ہے۔

ادبی موضوعات

(۱) مقالات ماجد۔ تاج آفس بمبئی۔ دوسرا ایڈیشن عشرت بک ڈپو لاہور نے چھاپا۔

(۲) انشائے ماجد (جلد اول) نسیم بک ڈپو لکھنؤ

(۳) انشائے ماجد (جلد دوم) نسیم بک ڈپو لکھنؤ

(۴) انشائے ماجد یا لطائف ادب۔ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ

(۵) مضامین عبدالماجد۔ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد۔

(۶) اقبالیات ماجد۔ اقبال اکیڈمی۔ حیدر آباد

(۷) اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ

(۸) زود پشیماں (ڈرامہ) الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

(۹) تغزل ماجدی (شاعری) مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ

(۱۰) نشریات ماجد۔ خاتون منزل لکھنؤ

آپ بیتی و سوانح

(۱۱) آپ بیتی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ

(۱۲) چند سوانحی تحریریں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ

(۱۳) حکیم الامت۔ نقوش و تاثرات۔ دار المصنفین اعظم گڈھ

(۱۴) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق (جلد اول) دار المصنفین اعظم گڈھ

(۱۵) محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق (جلد دوم) دار المصنفین اعظم گڈھ

(۱۶) محمود غزنوی۔ وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی امر تسر

(۱۷) اردو کا ادیب اعظم۔ ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان۔ کراچی۔

(۱۸) معاصرین۔ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ

(۱۹) وفیات ماجدی یا نثری مرثئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ

فلسفہ ونفسیات

(۲۰) فلسفہ جذبات۔ انجمن ترقی اردو ہند

(۲۱) فلسفہ اجتماع۔ انجمن ترقی اردو ہند

(۲۲) فلسفہ کی تعلیم گزشتہ اور موجودہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

(۲۳) فلسفیانہ مضامین۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

(۲۴) مبادی فلسفہ (جلد اول) دار المصنفین اعظم گڈھ

(۲۵) مبادی فلسفہ (جلد دوم) دار المصنفین اعظم گڈھ

(۲۶) ہم آپ (پاپولر سائیکولوجی) ہندستانی اکیڈمی الہ آباد

(۲۷) غذائے انسانی۔ وکیل بک ٹریڈنگ ایجنسی۔ امر تسر

(۲۸) فرائض والدین۔ نولکشور ریجنڈ پو لکھنؤ

سفر نامے

(۲۹) تاثرات دکن۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی

(۳۰) سفر حجاز۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ

(۳۱) ڈھائی ہفتہ پاکستان میں یا مبارک سفر۔ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ

(۳۲) گیارہ سفر یا سیاحت ماجدی۔ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ۔

مذہبیات اور متعلقات

(۳۳) تفسیر ماجدی۔ تاج کمپنی لاہور

(۳۴) تفسیر ماجدی (جلد اول) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

(۳۵) اعلام القرآن یا قرآنی شخصیتیں صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ

(۳۶) الحیوانات فی القرآن۔ ندوۃ المعارف بنارس
(۳۷) بشریت انبیاء۔ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ
(۳۸) تصوف اسلام مطبع معارف اعظم گڈھ
(۳۹) تمدن اسلام کی کہانی۔ انجمن اسلامی تاریخ و تمدن علی گڈھ
(۴۰) جدید قصص الانبیاء کے چند ابواب۔ مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پیشاور
(۴۱) مسائل و قصص۔ ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد
(۴۲) مردوں کی مسیحائی، ادارۂ اشاعت اسلام حیدر آباد
(۴۳) مشکلات القرآنی یا قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن مدارس
(۴۴) قتل مسیح سے یہود کی بریت۔ اسلامی مشن لاہور
(۴۵) نورانی جینز۔ مجلس نشریات اسلام کراچی
(۴۶) یتیم کا راج۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند
(۴۷) سچی باتیں۔ دکن پبلشرز۔ حیدر آباد

خطبات

(۴۸) خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس لکھنؤ۔
(۴۹) ندوہ کا پیام ندولوں کے نام۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ
(۵۰) خطبات ماجدی۔ ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ
(۵۱) تمدن اسلام کا پیام۔ بیسویں صدی کے نام ادارہ ادبیات دہلی۔
(۵۲) پیام امن۔ دار المصنفین اعظم گڈھ
(۵۳) تاریخ اخلاق یورپ (حصہ اول) انجمن ترقی اردو ہند

تراجم وتالیفات

(۵۴) تاریخ اخلاق یورپ (جلد اول) انجمن ترقی اردو ہند
(۵۵) تاریخ تمدن (جلد دوم) علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ
(۵۶) تاریخ یورپ برائے انٹر میڈیٹ۔ دار الطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد
(۵۷) مکالمات برکلے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ
(۵۸) مناجات مقبول۔ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ

(۵۹) ناموران سائنس۔ میکملن۔ اینڈ کمپنی کلکتہ
(۶۰) منطق استخراجی واستقرائی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد
(۶۱) چہل حدیث ولی اللہی۔ صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ
(۶۲) بحرالمحبت، دارالمصنفین اعظم گڈھ۔
(۶۳) تحفہ خسروی۔ اودھ بک ایجنسی دریاباد

مرتبات ومکتوبات

(۶۴) خطوط مشاہیر۔ تاج کمپنی لاہور
(۶۵) فیہ مافیہ۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ
(۶۶) مکاتیب اکبر۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ
(۶۷) مکتوبات سلیمانی (جلد اول) صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ
(۶۸) مکتوبات سلیمانی جلد دوم صدق جدید بک ایجنسی لکھنؤ۔
(۶۹) مکتوبات ماجدی (جلد اول) ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ
(۷۰) مکتوبات ماجدی (جلد دوم) ادارہ انشائے ماجدی کلکتہ
(۷۱) رقعات ماجدی، پی، سی، ایچ سوسایٹی کراچی
(۷۲) دی سائیکولوجی آف لیڈر شپ۔ ٹی فشر ان ون۔ لندن
(۷۳) قرآن حکیم تفسیر و ترجمہ۔ تاج کمپنی، لاہور

انگریزی میں

(۷۴) ہولی قرآن ودھ ٹرانسلیشن۔ تاج کمپنی لاہور
(۷۵) تفسیر القرآن (نظر ثانی شدہ) جلد اول۔ اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز۔ لکھنؤ
(۷۶) تفسیر القرآن (نظر ثانی شدہ جلد دوم۔ اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز۔ لکھنؤ

کتابیات

(۱) آپ بیتی از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ ۱۹۸۹

(۲) چند سوانحی تحریریں از مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۸۵

(۳) مولانا عبدالماجد۔ حیات وخدمات۔ مولانا عبدالماجد دریابادیاکیڈمی لکھنؤ ۱۹۷۸

(۴) ذکر ماجد۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اکیڈمی ۱۹۸۱

(۵) عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار۔ از ڈاکٹر تحسین فراقی۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۹۳

(۶) تاریخ دریاباد از منشی برج بھوکن لال۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۲۵

رسائل کے خاص نمبر

(۱) فروغ اردو لکھنؤ۔ عبدالماجد دریابادی نمبر اگست۔ اکتوبر ۱۹۷ء

(۲) نیا دور لکھنؤ۔ عبدالماجد دریابادی نمبر اپریل مئی ۱۹۷۸ء

مولاناعبدالماجد دریابادی (۱۹۷۷-۱۹۹۲ء) کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے قلم کے ذریعہ اردو زبان وادب کو مختلف حیثیتوں سے مالا مال کیا۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک صاحب طرز ادیب وانشا پرداز، فلسفی، صحافی، عالم دین، محقق، نقاد، شاعر، ڈرامہ نگار، سوانح نگار، نفسیات داں، مترجم و مکتوب نگار تھے۔ وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بے تکان لکھتے رہے۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں ۷۰ سے زیادہ کتابیں اور بے شمار مضامین اور مقالات سپرد قلم کیے۔ انھوں نے تحریک خلافت کے ذریعہ ہندستان کی جنگ آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ وہ نازک سے نازک حالات میں بھی سچی باتیں لکھنے کا حوصلہ اور سلیقہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اخبار ”صدق جدید“ کے ذریعہ ہمیشہ یہ باور کرایا کہ اسلام دوسرے مذاہب سے ٹکراؤ کی ہرگز تعلیم نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس رواداری اور بھائی چارے کے برتاؤ کی تلقین کرتا ہے۔

عبدالماجد دریابادی اسلوب بیان کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے، اور ہر موضوع کو زبان کی لطافت اور کمالات کی وسعت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے طرز تحریر بھی ویسا ہی اختیار کرتے جو موضوع سے مناسبت رکھتا ہو۔ ایک فطری ادیب کی پہچان یہ ہے کہ موضوع خواہ کتنا ہی پیچیدہ اور خشک کیوں نہ ہو وہ اپنے طرز بیان کی دلآویزی کو برقرار رکھے۔ ان کی کوئی تحریر ادبی زبان کی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی۔ وہ یقیناً ایک صاحب طرز ادیب تھے جو اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔ انھوں نے مختلف بلکہ متضاد موضوعات پر جو کچھ لکھا وہ سب کا سب معیاری، قابل قدر اردو ادب میں قیمتی اضافے کی حیثیت رکھتا تھا۔

ڈاکٹر سلیم قدوائی کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کا تعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے خاندان سے ہے۔ تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک کشمیر یونی ورسٹی میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ اس وقت جواہر لال نہرو یونی ورسٹی نئی دہلی کے شعبہ انٹرنیشنل اسٹڈیز سے وابستہ ہیں۔ انگریزی اور اردو میں متعدد مضامین اور مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

پچیس روپے

ISBN 81-260-0459-2